دیوانِ سودا

انتخاب

ڈاکٹر وحید قریشی

بک لینڈ — لاہور

باہتمام

آغا امیر حسین

پبلشرز: بک لینڈ۔ دی مال۔ لاہور

پرنٹرز: ایل اینڈ کمپنی۔ دی مال۔ لاہور

بار اوّل۔ ۱۱۰۰۔ ۱۹۵۷ء

حاصلِ عمر نثارِ رہِ یارے کردم
شادم از زندگیِ خویش کہ کارے کردم

اس انتخاب کے لئے کلیاتِ سودا (دو جلد) مرتّبہ آسی ۱۹۳۲ء استعمال کیا گیا ہے، بقول شیخ چاند (سودا) اس میں الحاقی کلام بہت ہے لیکن کسی بہتر اڈیشن کی غیر موجودگی میں اس کے سوا چارہ نہ تھا۔

ترتیب

پیش لفظ
سودا کی غزل گوئی
۱ - غزلیات
نگاہ اوّل
نگاہ ثانی
نگاہ ثالث
۲ - رباعیات
۳ - تضحیکِ روزگار
۴ - شہر آشوب
۵ - غزلیات (فارسی)
۶ - واقعات کربلا کے دوہے
۷ - قصیدہ در مدح حضرت علی
۸ - قصیدہ در مدح عماد الملک غازی الدین خاں
۹ - کچھ سودا کے بارے میں

پیش لفظ

اس انتخاب کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں غزلوں کا حصّہ زیادہ ہے۔ سودا کی غزلوں کو بالعموم قابلِ اعتنا نہیں سمجھا گیا اور عام طور پر نقادوں کی بنی بنائی آرا سے متاثر ہو کر یہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ ان کا اصل میدان قصیدہ ہے غزل نہیں۔ لیکن بغور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سودا یہاں بھی بند نہ تھے ان کی غزل گوئی بھی ان کے لئے مایۂ افتخار ہو سکتی ہے۔

قصیدے میں ان کی نرگسیت نے اگر بلاواسطہ اپنی تسکین کا سامان پا یا ہے اور ہجویات میں وہ اگر محض اپنے ننہیال کی روایت کو نباہنے کے ساتھ ساتھ بالواسطہ مجروح شخصیت کا مظاہرہ کر رہے تھے تو اس کے ساتھ ہی غزل

میں ان کی شخصیت کے زیادہ نرم اور ہموار و نازک احساسات کے پہنچنے کا موقع نکلا
اس لئے ان کی شاعری کے اس رُخ کو بغیر کسی اعتذار کے پیش کیا جا رہا ہے۔

غزلوں کے انتخاب کے تین حصّے ہیں۔ نگاہ اوّل۔ اوّلین مطالعے (First Reading) کا نتیجہ ہے۔ نگاہِ ثانی میں دوسری نظر (Second Reading) اور نگاہِ ثالث ایسے اشعار کا انتخاب ہے جو پہلے اور دوسرے مطالعہ میں منتخب نہ ہو سکے۔ لیکن تذکروں کی ورق گردانی کے وقت پسند آ گئے۔

مقالے میں اختصار نظر آئے گا کچھ تو اس لئے کہ مؤلف کے خیال میں انتخاب کے ساتھ مقالے کی حیثیت تعارفی ہونی چاہیئے۔ دوسرے بعض گفتنی باتیں ایسی بھی تھیں جن کے اظہار میں ابھی مزید غور و فکر اور احتیاط کی ضرورت ہے۔ مثلاً نگہ سلیمان۔ پدر اور بعض دوسرے الفاظ دعوتِ فکر دیتے ہیں۔ لیکن سودا کی زندگی کے واقعات ابھی بہت کم ہمارے سامنے ہیں۔ اس لئے محض کلام کے مثبت اور منفی پہلوؤں سے نتائج مرتب کرنے سے گریز کیا گیا ہے۔

منفصل اسلامیہ ہائی سکول
گوجرانوالہ

وحید قریشی
۱۸۔ اپریل ۱۹۵۴ء

سودا کی غزل گوئی

کہتے ہیں وہ جو ہے سودا کا قصیدہ ہے خوب
ان کی خدمت میں لئے میں یہ غزل جاؤں گا
سودا

بارھویں صدی کا نصف آخر سودا کی شاعری کا زمانہ ہے۔ اس دور میں حاتم اور ان کے معاصرین کی ایہام گوئی پر زوال آیا۔ سودا اور ان کے رفقاء نے تازہ گوئی کی سند حاصل کی۔ جرأت اور ان کے ساتھیوں نے معاملہ بندی کا ہنگامہ اٹھایا۔ سودا کے سامنے دلّی کی محفلیں جمیں اور برباد ہوئیں۔ ان کے دیکھتے ہی

دیکھتے نوابانِ بنگش کا اثر و اقتدار بڑھا اور فرخ آباد کی محفلیں مرتب ہوئیں۔ جن لوگوں نے دِلّی کی بربادی دیکھی تھی، انہیں فیض آباد کا نوحہ بھی کہنا پڑا۔ اور اب بساطِ ادب لکھنؤ میں آ پچھی۔ سودا کے سامنے کم و بیش دو نسلیں آئیں اور گذر گئیں۔ ذوقِ سخن کا معیار اور طلبِ لذّت کے طور طریق بڑی سُرعت سے بدلتے رہے۔ تازہ گوئی نے حاتمؔ جیسے بزرگ شاعر کو راستہ بدلنے پر مجبور کر دیا اور وہ بھی اپنے شاگردوں کی بنائی ہوئی لیک پر چل نکلے۔ سودا کی غزل گوئی کا عروج اور اثر دلّی میں دھاک بٹھا کر ہندوستان گیر ہوتا چلا جا رہا تھا کہ میرؔ کی غزل گوئی نے سننے والوں کے منہ کا ذائقہ بدل دیا۔ سودا کی گھمبیر آواز کے سامنے میرؔ کی غم انگیز راگنی کچھ زیادہ ہی دلربا ثابت ہوئی۔ سودا کی کانٹے میں تلی ہوئی غزل گوئی جو شعر میں ایک لفظ کا ہیر پھیر بھی برداشت نہ کر سکتی تھی، اب اس کے وقار کا سوال تھا۔ دوسرے میرؔ کا جادو تو ایسا تھا کہ سودا بھی اپنے اس کم عمر معاصر کے اثر سے نہ بچ سکے۔ اس لئے نقادوں کی بحثیں اختلافِ رائے کی گنجائشیں نکالنے لگیں۔ قصیدہ گوئی سودا کا دائرہ خاص سمجھی گئی۔ اور غزل کا میدان میرؔ کے ہاتھ رہا۔ لیکن ع

ان کی خدمت میں لئے ہیں یہ غزل جاؤں گا!

سودا غزل گو تھے۔ روایت پرست نہ تھے۔ روایت پرست ہوتے، تو ایہام گوؤں کی ڈگر پر چلتے۔ لیکن روایت کے جاندار عناصر میں نئے رنگوں کی آمیزش سے اپنی آواز پیدا کرنا جانتے تھے۔ اسی میں ان کی عظمت، اور دوسروں کا اعتراف شکست پوشیدہ ہے۔ انہوں نے روایتی اسالیب سے کام لیا ہے۔ اور انہیں اپنی شخصیت کا جزو بنا کر اپنایا ہے۔ ذاتی استعداد کو چمکا کر اور روایت کو اپنی ہڈیوں میں رچا کر انہوں نے اپنی دنیا تخلیق کی۔ بعد میں میر حسن وغیرہ نے ان کا رنگ اٹھایا ہے۔ لیکن سودا کا رنگ تحریک نہ بن سکا۔ نقادوں کا فیصلہ یک طرفہ لیکن اٹل تھا۔ وہ قصیدہ گوئی میں انوری اور خاقانی تو ہو سکتے تھے۔ لیکن غزل میں میر کے سامنے ان کا چراغ نہیں جلا۔ موازنہ کا یہ طریقہ غلط قسم کے انداز فکر کا نتیجہ ہے۔ اس لئے صداقت پر مبنی نہیں۔ لیکن اس سے ادب کو جو نقصان پہنچتا رہا ہے، اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

سودا روایت کے دوستدار تھے۔ انہوں نے فارسی کی سالہا سال کی روایات کا احترام کیا۔ ان کے اشعار کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جس میں انہوں نے فارسی اور اردو شاعری کی بعض سقیم روایات کو نباہا ہے۔ لیکن اس میں بھی ایسے اشعار موجود ہیں جہاں وہ روایتی پیکروں میں اپنے خون کی نمی شامل کر سکے۔

اپنی ذات کے مختلف اللون پہلوؤں کا عکس ڈال کر اور روایتی افکار و واقعات تخیئلی تجربے کی سان پر چڑھا کر وہ ایسے اشعار بھی کہہ گزرے ہیں جن میں روایتی محبوب کی روایتی بے وفائی، گل و بلبل کی رسمی کہانی اور عاشق کی ہجراں نصیبی کے باوجود دل کی دھڑکن صاف سنائی دیتی ہے۔

اُمید ہو گئی کچھ گوشہ گیری دل میں رہا کرے ہے تمنا اسیری دل میں

ہزار قول کریں یہ نباہ کا سودا مجھے بتاں کی محبّت کا اعتبار نہیں

عاشق کی بھی کٹتی ہیں کیا خوب طرح راتیں
دو چار گھڑی رونا دو چار گھڑی باتیں

جب نظر اس کی آن پڑتی ہے زندگی تب دھیان پڑتی ہے

دل کسی سے کہ جب بلٹتا ہے دین و دنیا سے جی اُچٹتا ہے

بلبلو مجھ کو نہ تکلیف کرو نالے کی
ڈوب جاویں گے لہو میں گل و گلزار کئی

گلہ لکھوں میں اگر تیری بے وفائی کا
لہو میں غرق سفینہ ہو آشنائی کا

نہ جانے حال کس ساقی کو یاد آتا ہے شیشے کا
کہ لے کے ہچکیاں جیوڑا نکل جاتا ہے شیشے کا

قفس کے پاس نہ جا کر کے نام لو گل کا
ضرور کیا ہے کہ ناحق ہو خون بلبل کا

اس مرغِ ناتواں کی صیاد کچھ خبر ہے
جو چھوٹ کر قفس سے گلزار تک نہ پہنچا

تب تری بزم میں سودا کو میں دیکھا جب تک
کچھ خموشی کے سوا اس کو سروکار نہ تھا

سودا ان اشعار میں روایت سے شکست کھا کر نہیں، اسے اپنا کر چل رہے ہیں۔ لیکن بعض مواقع ایسے بھی ہیں، جہاں روایتی صورت تراشی کی بجائے سودا روایت سے کنی کاٹ کر صاف نکل گئے۔ یا پھر انہوں نے روایت کے بتوں کو توڑا

بھی ہے۔ رسمی تصورات کی عام روش کی جگہ اپنے مخصوص ذوق اپنی نفسی کیفیتوں اور ذاتی ناکامیوں کو اچھوتے پیرائے میں پیش کیا ہے۔

سودا قمارِ عشق میں شیریں سے کوہکن
بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو دے سکا

نواحی میں ترے کوچے کے ہے یہ حال سودا کا
کہ جُوں جغد آشیاں گم کر کے بستی میں پھرے بھٹکا

تجھ قید سے دل ہو کر آزاد بہت رویا
لذت کو اسیری کی کر یاد بہت رویا

گرچہ رویا میں ترے غم میں بہت سا لیکن
اپنے رونے کا مجھے رات تسلسل بھایا

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیئے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

صورتِ ماہِ شبِ بسنت وچہارم سوداؔ
کچھ ڈھلا جلوہ سے آیا وہ نظر آخر شب

ساقی گئی بہار رہی دل میں یہ ہوس
تو منتوں سے جام دے اور میں کہوں کہ بس

مہر ہر ذرے میں مجھکو ہی نظر آتا ہے
تم بھی ٹک دیکھو کہ صاحبِ نظراں ہے کہ نہیں

دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لئے پھرتا ہوں
کچھ علاج ان کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں

تھی سرد مہری اس کی آبِ حیات دل کو
جھوٹے تپاک نے تو کچھ آگ سی لگائی

سمجھ کے رکھیو قدم دشتِ خار میں مجنوں
کہ اس نواح میں سوداؔ برہنہ پا بھی ہے

وے صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں

نگہ ہوا آباد جس کے دل کا نہ پوچھ اس سے تو دکھ ہمارا
یہ درد سن اس رئیس سے ٹک جو لٹتے دیکھے دیار اپنا

خواب شیریں میں ہے اور دل ہے مرا مائل شوق
جی دھڑکتا ہے کہ بیدار کروں یا نہ کروں

دراصل ان کے نزدیک اپنی ذات زیادہ ہی اہم رہی ہے۔ اس کا اظہار ایک تو اشعار کے عام لب ولہجہ سے ہوتا ہے جس میں زبان کا طنطنہ پایا جاتا ہے۔ قصیدہ کی پرشکوہ فضا اور زبان اسے زیادہ ہی راس آئی لیکن غزل میں بھی یہ جھل آواز کی فراوانی اس کی شاعری کو ایک خاص رنگ دے جاتی ہے جسے تذکرہ نگاروں نے عام طور پر سودا کا انداز بیان قرار دے لیا ہے اور ایسے اشعار بالعموم انتخاب کئے جن میں لہجہ کی یہ شوکت زیادہ نمایاں تھی لیکن انداز بیان صرف الفاظ کے مخصوص استعمال اور اصوات کی ترتیب ہی کا تو نام نہیں۔ اس میں شخصیت کا پورا اظہار اور روایت کی گھلاوٹ بھی شامل ہوتی ہے۔ سودا کے

نظریۂ شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس بات کا پورا احساس تھا۔ قصائد میں ان کی شخصیت کا خارجی پہلو اگر زیادہ اجاگر رہا ہے تو غزل میں کردار کی داخلی کیفیات، ان کا حزن و ملال اور یاس انگیزی زیادہ نمایاں ہے۔ قصیدہ اور غزل کا یہ روایتی پہلو ایسا تھا جس پر شعراء اور نقاد عام طور پر متفق تھے شعرا جذباتی کیفیات کے ان پہلوؤں کو زیادہ اہم جانتے تھے۔ جو مادی عشق و محبت کے تجربات اور دنیاوی واقعات پر مشتمل ہو۔ یہی وجہ ہے کہ غزل میں سودا داخلیت کی طرف جھکے اور قصیدے میں خارجیت کی طرف[1]۔ سودا کی خوش طبعی ان کی ہجویات کی نذر ہو گئی۔ قصیدے میں بڑے سیدھے لفظوں میں نرگسیت کی روداد لکھی گئی۔ غزلوں میں جہاں داخلیت ضروری تھی، شخصیت کو مختلف سطحوں پر اپنی تسکین کا سامان تلاش کرنا پڑا۔ محض پرشکوہ زبان یہاں کافی نہ تھی۔ یہاں سودا کی ذات کے دکھتے پہلوؤں کی نقاب کشائی زیادہ ہوئی۔ خواجہ باسط کی میراور

---

[1] خارجیت سے مراد یہاں خارجی اشیاء و عوامل کی فوٹوگرافی نہیں۔ کیونکہ کوئی داخلیت پسند بھی باہر کی دنیا سے پوری طرح کٹ کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ان اصطلاحات سے میری مراد ان رشتوں کے قرب و بعد سے ہے جو خارجیت پسند اور داخلیت پسند باہر کی دنیا سے قائم کرتے ہیں۔

سودا کے درمیان آہ اور واہ کی حدِ فاصل درست ثابت نہ ہوئی۔ غزل میں سودا میر ہی کی طرح اپنی حرماں نصیبی کے ہاتھوں زخمی پرندے کی طرح چیختے ہیں ۔ نرگسیت کے شکار کے دل کی گہرائیوں میں سکون کہاں؛ وہ اپنے انتہائی جذباتی لمحات میں اپنے آپ کو تنہا اور مظلوم محسوس کرنے لگے۔ غم کی یہ ثانیت سودا کی غزل گوئی کا مستقل موضوع ہے۔

جی مرا مجھ سے یہ کہتا ہے کہ ٹل جاؤں گا
ہاتھ سے دل کے ترے اب میں نکل جاؤں گا
لطف اے رشک کہ جوں شمع گھلا جاتا ہوں
رحم اے آہِ شرربار کہ جل جاؤں گا
چین دینے کا نہیں زیرِ زمیں بھی نالہ
سوتوں کی نیند میں کرنے کو خلل جاؤں گا
قطرۂ اشک ہوں پیارے مرے نظارے سے
کیوں خفا ہوتے ہو پل مارتے ڈھل جاؤں گا
چھیڑ مت بادِ بہاری کہ میں جوں نکہتِ گل
پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا

جب بادۂ خونِ دل ہو تو سیرِ چمن کجا
ساقی وہ نو بہار و شرابِ کہن کجا

قاصدِ اشک آکے خبر کر گیا
قتل کوئی دل کا نگر کر گیا

دیکھئے واماندگی اب کیا دکھائے
قافلہ یاروں کا سفر کر گیا

سیر کی یوں کوچۂ ہستی کی ہم
نے میں سے جوں نالہ گزر کر گیا

کدھر کو چھوڑ گئے مجھکو ہمرہاں تنہا
پھروں ہوں دشت میں جُوں گردِ کارواں تنہا

نگر آباد ہیں بسے ہیں گاؤں
تجھ بن اوجڑ پڑے ہیں اپنے بھاؤں
تجھ دہان و کمر سے ہے جنہیں عشق
اب انھوں کا کہیں نہ ٹھور نہ ٹھاؤں
نوبتِ قیس ہو چکی آخر
اب تو سودا کا باجتا ہے ناؤں

سودا نہ تن ہمارے سے شعلہ اُٹھا کبھو
بھٹی کی طرح جل گئے کچھ من ہی من میں ہم

درد میرے استخواں کا کیا ترے دمساز ہے
اس قدر اے نے تری محزون کیوں آواز ہے

تنہائی کا احساس سودا کی ذاتی مشکلات کا نتیجہ ہے۔ اس کی بے اولادی ایک ایسا واقعہ ہے جس کے بارے میں مؤرخین کے بیانات متضاد ہیں۔ انہیں کتے پالنے کا شوق تھا۔ ان کی غزلوں میں بعض داخلی شہادتیں انہیں ایسے شخص کے روپ میں ظاہر کرتی ہیں جسے اولاد کی محرومی کا غم ہے۔ سودا کے ہاں ثمر کا لفظ ایک ایسا غم انگیز محرک ہے جو بار بار سودا کو غم زدہ بناتا رہتا ہے۔

میں ہوں وہ نخل کہ جس نخل کو قیامت تک
بہار کیسی ہی آوے نہ برگ و بار نہیں

آہ اپنی میں ثمر ڈھونڈے ہے اے سودا تو کیا
بید مجنوں کی نہ شاخیں ہم نے پھلیاں دیکھیاں

درخت خشک ہوں اس باغ میں خدا نہ کرے
کہ باغباں مرے احوال سے خبر پاوے

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر اندازِ چمن کچھ تو ادھر بھی

اس کے ساتھ ہی اس زمانہ کی مٹتی ہوئی تہذیب کا درد بھی ہے جسے سوؔدا نے مرزا منش قرار دیا ہے۔ مرزا کا لفظ اس زمانہ کی شاعری کا ایک زبردست استعارہ ہے۔ جس پر کم و بیش سبھی شاعروں نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ مرزا مظہر جانجاں کے اشعار سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اس سے مراد ایسا نوابی ٹھاٹھ ہے۔ جس کے ساتھ زوال کا تصوّر بھی چپکا ہوا ہے۔ سودا کہتے ہیں۔

کیونکہ ہو باغ جانا اس میرزا منش کا
واں سرو میں نہیں ہے انداز کورنش کا

منتظر بابِ اجابت پہ رہے شب کونین
بے دماغی سے مناجات نہ ہونے پائی

دوزخ مجھے قبول ہے اے منکر و نکیر
لیکن نہیں دماغ سوال و جواب کا

بے دماغی، مرزا منشی حفظِ مراتب کا خیال، وقت کی سیماب پائی کا احساس اس دَور کے شعراء نے مرزا کے لفظ میں یہ سب کچھ کہا ہے۔ سودا خود بھی مرزا تھے۔ وہ اپنے آپ کو بھی اس بربادی کا استعارہ سمجھتے ہیں۔ اس سے غم کا احساس اور دنیا کی ناپائداری کا خیال زیادہ ہوتا گیا۔

دہر بانٹے تھا متاعِ دو جہاں اے سودا
بے نوائی نے مری اس کو اشارا نہ کیا

نے فکر ہے دُنیا کی نہ دیں کا متلاشی
اس ہستیٔ موہوم میں کس کام کا ہُوں میں

وہ سمندر ہے کہ جس کا نہ کہیں پاٹ لگے
کشتیٔ عمر مری دیکھئے کس گھاٹ لگے

ہم تو قفس میں آن کے خاموش ہو رہے
اے ہم صفیر فائدہ ناحق کے شور کا

"میں" کے لفظ میں سودا کی ایک اور مشکل کا حل ہے۔ اس کی شخصیت کا یہ پہلو غزل میں اپنی ذات کو شمع انجمن بنا کر تسکین پاتا ہے محبوب کی ذات پس منظر میں چلی جاتی ہے۔ کبھی کبھی سودا آپ بھی اپنے محبوب ہو گئے ہیں۔ ایڈلر کے خیال میں لوگ جو اپنی ذات کو زیادہ اہم سمجھتے ہیں، ہمیشہ ایسے شخص کو شریکِ حیات بنانا پسند کرتے ہیں، جو انہی کی ذات کا پرتو ہو تاکہ تمام عمر شکست و فتح کا کھیل جاری رہ سکے۔ نرگسیت کے ان مریضوں کے بارے میں فرائڈ کا قول ہے کہ مردانہ صفات والے محبوب ان کا مطمحِ نظر ہو جاتے ہیں۔ اس کا محبوب زلیخا نہیں یوسف ہے۔

ہیں عاشق اپنا اور معشوق اپنا آپ ہوں پیارے
گھسے پروانہ اس مجلس میں گا ہے شمع محفل ہوں

گدا دست اہلِ کرم دیکھتے ہیں
ہم اپنا ہی نقشِ قدم دیکھتے ہیں

ہم سر نوائیں کس کے آگے کہ بعد آسا
اپنے قدم کو اپنا مسجود جانتے ہیں

تجھ حسن کی اس واسطے ہے گرمئ بازار
اے شوخ کہ بس تیرا خریدار رہا میں

محکوم تصوّر کی مری ہے تری صورت
آگے مری آنکھوں کے شب و روز کھڑی ہے

ہمیں تو ایک سے ہیں حُسن میں صبیح و ملیح
کوئی ہو اپنا خریدار یہ نہ ہو وہ ہو

پوجے مجھے اس دیر کہن میں کیا پوجے گا پتھر کو!
مجھ وحشی کو سنا برہمن بتوں نے اپنا رام کیا

یعقوب ترے عہد میں یوسف کو جو روتا
کہتا میں کہ یہ فہم پیمبر سے عجب ہے

بولا وہ جسے تیری تصویر نظر آئی
یہ خواب زلیخا کی تعبیر نظر آئی

سودا کے لئے بر سرِ بازار ہوئے ہم
ہاتھ اس کے بکے جس کے خریدار ہوئے ہم

آخری زمانے میں سودا کے ان غموں میں "ہائے دلّی" بھی آجاتی ہے۔ دلّی کی گلیوں کا ماتم غزلوں میں جا بجا نظر آتا ہے۔

بلبل کو کیا تڑپتے میں دیکھا چمن سے دُور
یارب نہ کیجیو تو کسی کو وطن سے دُور

فراموش ان دنوں ہم شہریوں سے دل کا سودا ہے
خبر اس کی جہاں آباد کے یاروں سے مت پُوچھو!

کہیں مہتاب نے دیکھا ہے تجھ خورشید تاباں کو
پھرے ہے ڈھونڈتا ہر شب جہاں آباد کی گلیاں

سودا وطن کو تج کہ گردش سے آسماں کے
آوارۂ غریبی ہے اتنی مدّتوں سے

شوق اب زباں تک اپنی ہم شہریوں کی بھولا
نامہ جو اس کو پہنچا ان بے مروّتوں سے
کھولا اسے تو ہرگز اک لفظ بھی نہ سمجھا
قاصد سے پوچھے معنی رو رو اشارتوں سے

یہ ساری باتیں گھل مل کر ان کی غزل گوئی میں ایک ایسی فضا تیار کرتی ہیں جس میں غم کی شدّت، لہجے میں بلا کا سوز، اُداسی اور اندر ہی اندر سلگنے کی کیفیت ہے۔ یہ کسک دو چار بار انہیں میرؔ کے دروازے پر بھی لے گئی ہے چنانچہ ان کے ہاں چند ایسی غزلیں موجود ہیں جو میرؔ کی مخصوص بحروں اور ان کے لہجہ میں ہیں۔ ان میں سوداؔ کی اپنی شخصیت دبی نہیں بلکہ میرؔ و سوداؔ کے ملے جلے تصوّرات نے ان میں تنوع پیدا کر دیا ہے۔

ناگن کا اس زلف کی مجھ سے رنگ نہ پوچھو کیا حاصل
خواہ تھی کالی خواہ تھی پیلی بس نے اپنا کام کیا
تھا بجوانی فکر و تردد بعد از پیری پایا چین
رات تو کاٹی دکھ سکھ ہی میں صبح ہوئی آرام کیا
خاص کروں میں ہی نظارہ تو تو دید کی لذّت ہے

کور بھلی یہ آنکھیں اس دن جس دن جلوہ عام کیا
مہر و وفا و شرم و مروّت، سبھی کچھ اس میں سمجھے تھے
کیا کیا دل دیتے وقت اس کو ہم نے خیال خام کیا
شمع رخوں سے روشن ہو گھر ایسے اپنے نصیب کہاں
صبح ازل سے قسمت نے خاموش چراغ شام کیا

یاد میاں اب دل میں تیرے وے باتیں نہیں آتی ہیں
کس مہ وش کی چاؤ کری جو آنکھیں بھی شرماتی ہیں
خون ہمارے دل کا پیویں جس صورت سے چاہیں وہ
بس کب چل سکتا ہے ان سے جو اکھیاں مدھ ماتی ہیں
پھنسواتی ہیں دل کو میرے زلف میں ہر اک مہ رُو کے
آنکھیں میری مجھ سے یارو ناحق بیر بساتی ہیں
گئے وہ دن جو تلخ تمہارے منہ سے میٹھا لگتا تھا
سنو ہو پیارے اب وہ باتیں تم کو نہیں سہاتی ہیں
گھر سے باہر جلد نکل اب تیری خاطر ہے یہ حال

جانیں سب عشاق کی پیارے سینوں میں گھبراتی ہیں
ریختہ کہہ کہہ ہوا دیوانہ سودا تو پھر عجب نہیں
عشق کی باتیں افلاطونی پل میں مدھ بوراتی ہیں

اگن نے تیرے برہ کے جب سے جھلس دیا ہے کلیجہ میرا
ہیے کی دھڑکن میں کیا بتاؤں یہ کوئلہ سا چٹک رہا ہے
جنہوں کی چھاتی سے پار برچھی ہوئی ہے رن میں وہ سورما ہیں
بڑا وہ ساونت من میں جس کے برہ کا کانٹا کھٹک رہا ہے
مجھے پسینہ جو تیرے مکھ پہ دکھائی دے ہے تو سوچتا ہوں
یہ کیونکہ سورج کی جوت آگے ہر ایک تارا چھٹک رہا ہے
کبھو لگا ہے نہ آتے جاتے جو بیٹھ کر ٹک اسے نکالوں
سجن جو کانٹا ہے تجھ گلی کا سو پگ سے میرے کھٹک رہا ہے

تنوع سودا کی غزل گوئی کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ ان کی مار، میر کی طرح محض دو چار موضوعات تک نہیں۔ وہ بھی ہماری آپ کی دنیا کی بات کرتے ہیں۔ ان کا عشق بھی مادی ہے۔ لیکن مادی عشق میں رنگا رنگی اور سنئے

نئے تجربوں کی دھوم دھام سودا کو اس لئے میسر ہے کہ ان میں شاعر کی (Hightened Sensibility) موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے تجربات کو دیکھ کر، پرکھ کر، اور ابتذال کی آلائشوں سے پاک کر کے پیش کرتے ہیں۔

آہ اس دل نے تجا ننگ وحیا کو ورنہ
کیا کیا باتیں ہیں تمہاری کہ ہمیں یاد نہیں

تنہا کہیں بٹھا کے تجھے آج ایک بات
دل چاہتا ہے کہیے مری جان، پر نہیں

بے وجہ آئینہ نہیں ھر بار دیکھنا
کوئی دم کو پھولتا ہے یہ گلزار دیکھنا
نرگس کی طرح خاک سے میری اگی ہے چشم
ٹک آن کے یہ حسرت دیدار دیکھنا
تجھ بن عجب معاش ہے سودا کا ان دنوں
تو بھی ٹک اس کو جا کے ستمگار دیکھنا

نے حرف و نے حکایت و نے شعر و نے سرود
نے سیرِ باغ و نے گل و گلزار دیکھنا
خاموش اپنے کلبۂ احزاں میں روز و شب
تنہا پڑے ہوئے در و دیوار دیکھنا
یا جا کے اس گلی کو جہاں تھا ترا گزار
لے صبح و تا بہ شام کئی بار دیکھنا
تسکینِ دل نہ اس میں بھی پائی تو پھر شغل
پڑھنا یہ شعر گر کبھو اشعار دیکھنا
کہتے تھے ہم نہ دیکھ سکیں روزِ ہجر کو
پر جو خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا

نسیم ہے ترے کوچے میں اور صبا بھی ہے
ہماری خاک سے دیکھو تو کچھ رہا بھی ہے
خیال اپنے میں گو ہوں ترانہ سنجاں مست
کہ اپنے کو دلوں کے کبھی سُنا بھی ہے

ستم روا ہے اسیروں پہ اس قدر صیّاد
چمن چمن کہیں بلبل کی اب نوا بھی ہے

سمجھ کے رکھیو قدم دشتِ خار میں مجنوں
کہ اس نواح میں سوداؔ برہنہ پا بھی ہے

یہ کون حال ہے احوالِ دل پہ اے آنکھو
نہ پھوٹ پھوٹ کے اتنا بہو ہوا سو ہوا

تصویر تری مجھ بن مانی نے جو کھینچی تھی
انداز سمجھ اس کا بہزاد بہت رویا

سوداؔ یہ کیا ہوا نہیں صحرا میں آج قیس
تھا ہی دلوں پہ داغِ دلِ کوہ کن ہنوز

جس روز کسی اور پہ بیداد کرو گے
یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کرو گے

فکرِ معاش و عشقِ بتاں یادِ رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کرے

ان کیفیتوں کے اظہار میں وہ انتہائی بلندی پر اس وقت پہنچتے ہیں جب صبا، بادِ بہاری، صدا یا کوئی اور آنکھوں کو نظر نہ آنے والی چیز ان کے ذہن میں آتی ہے۔ وہ ان گریز پا استعاروں کی مدد سے اپنے تجربے کی غایت اور اس کی وسعتوں کا جائزہ لیتے ہیں۔

اے ساکنانِ کنجِ قفس صبح کو صبا
سنتی ہی جائے گی سوئے گلزار کچھ کہو

بہار بے سپر جام یار گزرے ہے
نسیم تیری چھاتی کے پار گزرے ہے
یہ آدمی ہے کہ ہر بار تا بھرے ہے یہ سنگ
کہ بادِ تند سوئے کہسار گزرے ہے

اس طرح کوندے کی طرح چمک کر مٹ جانے والے جذبات کی عکاسی کا امکان بھی پیدا ہو گیا ہے۔ اس سے سودا نے ایک اچھوتی ٹیکنیک نکالی

ہے۔ وہ ایک فلم کے ماہر کی طرح اپنی توجہ انتخاب اور ردّ میں صرف کرتے ہیں۔ بعض اوقات (sound image) اور بیشتر صرف (Visual image) پیدا کرتے ہیں۔

ادھر شروع ہوا صبح نغمۂ بلبل
ادھر بہار سے ہر ایک گل نے جام لیا

چمن میں کھلکھلا کر جب ہنسا تو ساتھ غیروں کے
گرا اپنے وہیں دل کا گلِ نورستہ کمھلا کر

کن نے کیا خرام چمن میں کہ اے صبا
لاتے ہیں بوئے ناز سے بھر بھر کے جھولیاں

اُڑتا پھرے ہے نامہ گلی میں کسی طرف
دھڑ سے جدا پڑا ہے سر نامہ بر کہیں

ہے مدّتوں سے خانۂ زنجیر بے صدا
معلوم ہی نہیں کہ دوانے کدھر گئے

ہوں ہیں وہ وحشیِ رم خوردہ کہ تا دشتِ عدم
بات کھڑکے ہے تو مانندِ صدا جاتا ہوں

کیمرہ میں تو تیز روشنی اور سائے کی مدد سے مناظر کو نکھار کر نیکھا کرتا ہے۔ اور ہماری توجہ کو ایک مرکز پر لاتا ہے۔ سودا یہ کام مناظر کے انتخاب سے لیتے ہیں۔ انوکھے زاویے پیش کرتے ہیں۔ چکاچوند پیدا کرتے ہیں۔ بعض اوقات رنگوں کے ذکر سے بھی انہوں نے مناظر میں نکھار پیدا کیا ہے یہ (Colour Sense) سودا کے ہاں غالباً آخری دور کی نئی نسل کی وجہ سے آئی ہے جنھوں نے انسانی حواس کا یہ مصرف دریافت کر لیا تھا لیکن چونکہ ابھی یہ ابتدائی زمانہ تھا اس لئے سودا کے ہاں رنگوں کی حس کا کمال صرف تشبیہات میں ظاہر ہو پایا ہے۔

لعل حل کردہ ہے جوں ظرفِ بلوریں کے بیچ
پیرہن پہنے ہے جس دم وہ گل اندام سفید

گرم جوشی نہ کرو مجھ سے کہ مانندِ چنار
اپنی ہی آگ میں میں آپ جلا جاتا ہوں

ساقِ سیمیں تری شب دیکھ کے گوری گوری
شرم سے شمع ہوئی جاتی ہے تھوڑی تھوڑی

چمن میں بلبلوں نے جب نہ پائے عشق کے چہکے
لگی سارے چمن کو آگ جتنے تھے کنول دہکے

سودا کے ہاں روایت کی پاسداری بھی ہے اور روایت شکنی بھی تنہائی کا احساس، بے اولادی کا غم، مٹتی ہوئی ثقافت کا خیال۔ دلّی کا نوحہ، نرگسیت، رنگِ میر، تجربات کی دھوم دھام، آنکھوں کو نظر نہ آنے والی اشیا سے تشبیہہ۔ نکھرے ہوئے مناظر کی تصویر کشی (Visual image) (Colour senses) اور (Sound image) سودا کی غزل گوئی کے وہ عناصر ہیں جو اس کی شاعری کو آب و رنگ عطا کرتے ہیں۔ اس کی غزل گوئی میں بڑی آب و تاب۔ اس کے اشعار میں بڑی تازگی اور تجربے میں رنگا رنگی اور گہرائی ہے۔ اس لئے اُردو غزل میں سودا کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

وحید قریشی

(۱۰ر اپریل ۱۹۵۴ء)

(۱)

غزلیات

نگاہِ اوّل

بیکس کوئی مرے تو جلے اُس پہ دل مرا
گویا ہے یہ چراغ غریباں کی گور کا
ہم تو قفس میں آن کے خاموش ہو رہے
اے ہم صفیر فائدہ ناحق کے شور کا

کس سے بیان کیجئے حالِ دلِ تباہ کا
سمجھے وہی اسے جو ہو زخمی تری نگاہ کا
دین و دل قرار و صبر عشق میں تیرے کھو چکے
جیتے جو اب کی ہم بچے نام نہ لینگے چاہ کا

گلا لکھوں میں اگر تیری بیوفائی کا
لہو میں غرق سفینہ ہو آشنائی کا

دوزخ مجھے قبول ہے اے منکر و نکیر
لیکن نہیں دماغ سوال و جواب کا

نجانے حال کس ساقی کو یاد آتا ہے شیشے کا
کہ لے لے ہچکیاں جیوڑا نکل جاتا ہے شیشے کا
نجانے یاد کہ روتا ہے کس کے دل کے صدمہ کو
کہیں ٹکڑا جو سودا کو نظر آتا ہے شیشے کا

قفس کے پاس نہ جا کر کے نام لو گل کا
ضرور کیا ہے کہ ناحق ہو خون بلبل کا
خبر شتاب لے سودا کے حال کی پیارے
نہیں ہے وقت مری جان یہ تامل کا

جی مرا مجھ سے یہ کہتا ہے کہ ٹل جاؤنگا
ہاتھ سے دل کے ترے اب میں نکل جاؤنگا
لطف اے اشک کہ جوں شمع گھلا جاتا ہوں
رحم اے آہ شرربار کہ جل جاؤنگا

چین دینے کا نہیں زیرِ زمیں بھی نالہ
سوتوں کی نیند میں کرنے کو خلل جاؤنگا

قطرۂ اشک ہوں پیارے مرے نظّارے سے
کیوں خفا ہوتے ہو پلمارتے ڈھل جاؤنگا

چھیڑمت بادِ بہاری کہ میں جوں نکہت گل
پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤنگا

کہتے ہیں وہ جو ہے سوؔدا کا قصیدہ ہے خوب
ان کی خدمت میں لئے میں یہ غزل جاؤنگا

ترے خط آنے سے دل کو مرے آرام کیا ہوگا
خدا جانے کہ اس آغاز کا انجام کیا ہوگا

ہو جس کی چشم گردش سے یہ بیہوشی دو عالم کی
بھلا دیکھو تو پھر وہ ساقی گلفام کیا ہوگا

نہ آنکھوں میں ترے جادو نہ ہرگز سحر زلفوں میں
یہ دل جس سے ہے دیوانہ محبت کا ہے وہ لٹکا

سودا قمار عشق میں شیریں سے کوہکن
بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا

کہیں شمار بہم دل کے یار داغوں کا
تو آ کہ سیر کہیں آج اپنے باغوں کا

کیونکہ ہو بار غ جانا اس میرزا منش کا
واں سرو میں نہیں ہے آداب کورنش کا

قیس اور فرہاد و وامق پہ جو گذرا سو سنا
مجھ پہ دیکھو اس بت بیباک سے کیا کیا ہوا

جو گذری مجھ پہ مت اس سے کہو ہوا سو ہوا
بلا کشان محبت پہ جو ہوا سو ہوا
یہ کون حال ہے احوال دل پہ اے آنکھو
نہ پھوٹ پھوٹ کے اتنا بہو ہوا سو ہوا

تجھ قید سے دل ہو کر آزاد بہت رویا
لذّت کو اسیری کی کر یاد بہت رویا
تصویر مری تجھ بن مانی نے جو کھینچی تھی
انداز سمجھ اُس کا بہزاد بہت رویا

ادھر شروع ہوا صبح نغمۂ بلبل
ادھر بہار سے ہر ایک گل نے جام لیا

صدمہ ہر چند ترے جور سے جاں پہ آیا
تس پہ شکوہ نہ کبھی میری زباں پہ آیا

گرچہ رویا میں ترے غم میں بہت سا لیکن
اپنے رونے کا مجھے رات تسلسل بھایا
بے تصنّع تجھے کہتا ہوں یقیں کر سودا
گل جدا شاخ سے جس دم کہ ہوا مرجھایا

صبح کو جیتا تو نکلا گھر سے میں پر کیا کہوں
مرگ تھی اِک طرح کی جو رات میں تجھ بن جیا

لے وجہ آئینہ نہیں ہر بار دیکھنا
کوئی دم کو پھولنا ہے یہ گلزار دیکھنا
نرگس کی طرح خاک سے میری اوگی ہے چشم
ٹک آن کے یہ حسرتِ دیدار دیکھنا
کھینچے تو تیغ ہے حرم دل کے صید پر
اے عشق پر بھلا تو مجھے مار دیکھنا
کرتا تو ہے تو آن کے سودا سے اختلاط
کوئی لہر آگئی تو مرے یار دیکھنا

تجھ بن عجب معاش ہے سودا کا ان دنوں
تو بھی ٹک اُس کو جا کے ستمگار دیکھنا
نے حرف و نے حکایت و نے شعر و نے سخن
نے سیر باغ و نے گل و گلزار دیکھنا

خاموش اپنے کلبۂ احزان میں روز و شب
تنہا پڑے ہوئے در و دیوار دیکھنا
یا جا کے اس گلی کو جہاں تھا ترا گذر
لے صبح تا بہ شام کئی بار دیکھنا
تسکینِ دل نہ اس میں بھی پائی تو بہرِ شغل
پڑھنا یہ شعر گہ کبھو اشعار دیکھنا
کہتے تھے ہم نہ دیکھ سکیں روزِ ہجر کو
پر جو خدا دکھا دے سو ناچار دیکھنا

نگہ ہو آباد جس کے دل کا نہ پوچھ اس سے تو دکھ ہمارا
یہ درد سن اس رئیس سے ٹک جو لٹتے دیکھے دیار اپنا

روشن ہے وہ ہر ایک ستارے میں زلیخا
جس نور کو تو نے مہ کنعاں میں دیکھا
سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانئیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

کیوں کر نہ بکوں ہیں ہاتھ اس کے
یوسف کی طرح میں خواب دیکھا

جب بادہ خون دل ہو تو سیر چمن کجب
ساقی وہ نو بہار و شراب کہن کجا

اس مرغ ناتواں کی صیاد کچھ خبر ہے
جو چھوٹ کر قفس سے گلزار تک نہ پہنچا

شب تری بزم میں سوداؔ کو میں دیکھا جب تک
کچھ خموشی کے سوا اس کو سروکار نہ تھا

کدھر کو چھوڑ گئے مجھ کو ہمرہاں تنہا
پھروں ہوں دشت میں جوں گرد کارواں تنہا

سوداؔ پھر آج تیری آنکھیں بھر آئیاں ہیں
عالم کے ڈوبنے میں کل کچھ بھی رہ گیا تھا

ہمیں تو غم ہی میں گذرے ہے عمر تیرے ساتھ
جنہیں خوشی تھی انہیں موت ہے بہ غم جینا

دھر بانٹے تھا متاعِ دو جہاں اے سودا
بے نوائی نے مری اس کو اشارا نہ کیا

ناگن کا اس زلف کی مجھ سے رنگ نہ پوچھو کیا حاصل
خواہ تھی کالی خواہ تھی پیلی بس نے اپنا کام کیا

پوج مجھے اس دیر کہن میں کیا پوجے ہے پتھر کو
مجھ وحشی کو سنا برہمن بتوں نے اپنا رام کیا

تھا جوانی فکر و تردد بعد از پیری پایا چین
رات تو کاٹی دکھ سکھ ہی میں صبح ہوئی آرام کیا
خاص کروں میں ہی نظارہ تو تو دید کی لذّت ہے
کور پھلیں یہ آنکھیں اس دن جس دن جلوہ عام کیا

مہر و وفا و شرم و مروّت سبھی کچھ اس میں سمجھے تھے
کیا کیا دل دیتے وقت اس کو ہم نے خیال خام کیا
لذّت دی نہ اسیری نے صیاد کی بے پروائی سے
تڑپ تڑپ کر مفت دیا جی ٹکڑے ٹکڑے دام کیا
شمع رخوں سے روشن ہو گھر ایسے اپنے کہاں نصیب
صبح ازل سے قسمت نے خاموش چراغ شام کیا
فخر نہیں اے شیخ مجھے کچھ دین میں تیرے آنے کا
راہب نے جب منہ نہ لگایا تب میں قبول اسلام کیا
ادب دیا ہے ہاتھ سے اپنے کبھی بھلا مے خانے کا
کیسے ہی ہم مست چلے پر سجدہ ہر اک گام کیا
یار کہے ہے سودا کے ملنے سے ہم کو کیا حاصل
شعر جو اُن نے خوب کہے آفاق میں اپنا نام کیا

قاصد اشک آکے خبر کر گیا — قتل کوئی دل کا نگر کر گیا
دیکھیے واماندگی اب کیا دکھائے — قافلہ یاروں کا سفر کر گیا

سیر کی یوں کوچۂ ہستی کی ہم   نے میں سے جوں نالہ گذر کر گیا

گرچہ ہوں زیرِ فلک نالہ شب گیر نصیب
پر اسے کیا کروں یارو نہیں تاثیر نصیب

نالہ سینے سے کرے عزم سفر آخر شب
راہرو باندھے ہے چلنے پہ کمر آخر شب
انتہا عیش جہاں کی جو تو دیکھا چاہے
بزم مستاں پہ نگہ غور سے کر آخر شب
صورت ماہ شب بست و چہارم سودا
کچھ ڈھلا جلوے سے آیا وہ نظر آخر شب

جام گل نے کھو دیا ہے باغباں کا اب کی ہوش
نغمۂ بلبل سے گلشن کے در و دیوار مست

گذری پل مارتے اس طرح کہ جیسے شب وصل
بے خودی اپنی عجب بر سر احسان تھی رات

کل رخصتِ بہار تھی شبنم صفت میں زور
رویا ہر ایک گل کے گلے لگ چمن کے بیچ
دیتا ہے مشک مجھ کو مرے خون دل کی بُو
پہنچی شمیم زلف کسی کی ختن کے بیچ

تجھ بن بہت ہی کٹتی ہے اوقات بے طرح
یوں توں کہ دن تو گذرے ہے پر رات بے طرح
جائے گل تو ڑے ہے گلچیں باغ میں اب چوب گل
کچھ نظر آتی ہے اے سودا بہار آنے کی طرح

لعل حل کردہ ہے جوں ظرف بلوریں کے بیچ
پیرہن پہنے ہے جس دم وہ گل اندام سفید

ہزار حیف کوئی باغ میں نہیں سنتا
چمن چمن پڑی کرتی ہیں بلبلان فریاد

چمن میں کھلکھلا کے جب ہنسا تو ساتھ غیروں کے
گرا اپنے وہ وہیں دل کا گل تو رستہ کمہلا کر

بکھرائے ہو وہ زلف سیہ فام جہاں پر
کیا گذرے ہے اب دیکھیے تا شام جہاں پر

دام سے زمزمہ سازان چمن کو کیا کام
لائی آفت مری آواز حزیں میرے پر

تنہا نہ شمع روئے ہے سودا کی خاک پر
گل بھی تو لوٹتا ہے گریباں کو پھاڑ پھاڑ

آتے ہیں تیرے قافلۂ رفتگاں دلا
جا وے تو جا کہ آتی ہے بانگ جرس ہنوز

غنچوں سے رنگ و بو کی تمنا نکل چکی
تڑپے ہے خوں میں دل کے مری آرزو ہنوز

سودا یہ کیا ہوا نہیں صحرا میں آج قیس
بھٹا ہی دلوں پہ داغ دل کوہکن ہنوز

قاتل ہی میرے خون کی نہ رکھتا تھا آرزو
اپنے بھی دل میں تھی دم تلوار کی ہوس
ساقی گئی بہار ہی دل میں ہے یہ ہوس
تو منتوں سے جام دے اور میں کہوں کہ بس

خواہ اے رشک چمن راست سمجھ خواہ غلط
گل ترے عہد میں بلبل کا ہو دل خواہ غلط
آباد شہر دل تھا اسی شہریار تک
پہنچا نہ آ کوئی پھر اس اُجڑے دیار تک
ٹک دیکھ لیں چمن کو چلو لالہ زار تک
کیا جانے پھر جئیں نہ جئیں ہم بہار تک

کیا مچائی ان نے میرے دل کے کاشانے میں دھوم
شور ہے جس کے لئے کعبہ میں بت خانے میں دھوم
مٹ گئے وہ شور دل کے ہائے تب آئی بہار
ورنہ کیا کیا ہم بھی کرتے شہر و ویرانے میں دھوم

تجھ عشق میں روز خوش نہ دیکھا ۔ دکھ بھرتے ہی بھرتے مر گئے ہم
جوں شمع لبوں پہ آ رہا جی ۔ تھا من سو گداز کر گئے ہم

ماندگی گر محنت دنیا کی خواب آور ہو یاں
شور محشر کو بھی سودا سمجھیں اک افسانہ ہم

خندۂ گل بے نمک فریاد بلبل بے اثر
اس چمن سے آہ جا کر کیا کرینگے یاد ہم
شیشے کی طرح دل کے تئیں دھرکے تا سحر
خالی کریں ہیں بیٹھ تری انجمن میں ہم
سودا نہ تن ہمارے سے شعلہ اٹھا کبھو
بھٹی کی طرح جل گئے کچھ من ہی من میں ہم

میں عاشق اپنا اور معشوق اپنا آپ ہوں پیارے
گھے پروانہ اس مجلس میں گا ہے شمع محفل ہوں

زبس رنگینیٔ معنی مری عالم میں پھیلی ہے
سخن جس رنگ کا دیکھو گے میں بھی اس میں شامل ہوں

بوئے گل بادِ صبا کو چے کو کس کے یا رب
دوڑیں ہیں دونوں بہم باندھ کے دامن دامن

خواب شیریں میں ہے اور دل ہے مرا مائل شوق
جی دھڑکتا ہے کہ بیدار کروں یا نہ کروں
موسم گل ہی ہیں صیّاد سے جا کر یارو
ذکر مرغان گرفتار کروں یا نہ کروں

دل میں جس رنگ سے سودا کے گذرتی ہے لہر
موج مے کر نہ سکے جلوہ گری شیشے میں

دیکھیں صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں
اب دیکھنے کو جن کے آنکھیں ترستیاں ہیں
برسات کا تو موسم کب کا نکل گیا پر
مژگاں کی یہ گھٹائیں اب تک برستیاں ہیں

عہد میں تجھ حسن کے ماریں ہیں ان کو چوب گل
پھولوں کی جن پر کبھو چھوتی نہ چھڑیاں دیکھیاں
کیوں کے دل اپنا مکدر زندگی سے اب نہ ہو
صورتیں کیا کیا زمین پر ہم نے گڑیاں دیکھیاں
خاک و خوں میں صورتیں کیا کیا نہ رلیاں دیکھیاں
اے فلک باتیں تری کوئی نہ بھلیاں دیکھیاں
آہ اپنی میں ثمر ڈھونڈھے ہے اے سودا تو کیا
بید مجنوں کی نہ شاخیں ہم نے پھلیاں دیکھیاں

مہر ہر ذرہ میں مجھکو ہی نظر آتا ہے
تم بھی ٹک دیکھو کہ صاحب نظراں ہے کہ نہیں

دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لئے پھرتا ہوں
کچھ علاج ان کا بھی اے شیشہ گراں ہے کہ نہیں

تنہا کہیں بٹھا کے تجھے آج ایک بات
دل چاہتا ہے کیسے مری جاں پہ نہیں

آہ اس دل نے تجا ننگ و حیا کو ورنہ
کیا کیا باتیں ہیں تمہاری کہ ہمیں یاد نہیں

گرم جوشی نہ کرو مجھ سے کہ مانند چنار
اپنی ہی آگ میں میں آپ جلا جاتا ہوں

ہوں میں وہ وحشی رم خوردہ کہ تا دشت عدم
پات کھڑکے ہے تو مانند صدا جاتا ہوں

نے بلبل چمن نہ گل نو دمیدہ ہوں
میں موسم بہار میں شاخ بریدہ ہوں

نگر آباد ہے بسے ہیں گاؤں
تجھ بن اوجڑ پڑے ہیں اپنے بھانوں
تجھ دہان و کمر سے ہے جنھیں عشق
اب انہوں کا کہیں نہ ٹھور نہ ٹھانوں
نوبت قیس ہو چکی آخر
اب تو سودا کا باجتا ہے نانوں

بے اختیار منہ سے نکلے ہے نام تیرا
کرتا ہوں جس کسی کو پیارے خطاب تجھ بن

ملائم ہو گئیں دل پہ برہ کی ساعتیں کڑیاں
پھر کٹنے لگے اُن بن جنہوں بن کاٹتے گھڑیاں
گتھی نکلی ہیں لخت دل سے تار اشک کی لڑیاں
یہ انکھیاں کیوں مرے جی کے گلے کی ہار ہو پڑیاں
نہ غنچے گل کے کھلتے ہیں نہ نرگس کی کھلیں کلیاں
چمن میں لے کے خمیازہ کسی نے انگھڑیاں ملیاں

کہیں مہتاب نے دیکھا ہے تجھ خورشید تاباں کو
پھرے ہے ڈھونڈتا ہر شب جہاں آباد کی گلیاں

دوانا ہو گیا سودا تو آخر ریختہ پڑھ پڑھ
نہ میں کہتا تھا اے ظالم کہ یہ باتیں نہیں بھلیاں

بلبل چمن میں کس کی ہیں یہ بدشرابیاں
ٹوٹی پڑی ہیں غنچوں کی ساری گلابیاں
کن نے کیا خرام چمن میں کہ اے صبا
لاتے ہیں بوے ناز سے بھر بھر کے جھولیاں

ہم سر نوائیں کس کے آگے کہ بید آسا
اپنے قدم کو اپنا مسجود جانتے ہیں

تجھ حسن کی اس واسطے ہے گرمی بازار
اے شوخ ترا بس کہ خریدار رہا میں

عاشق کی بھی کٹتی ہیں کیا خوب طرح راتیں
دو چار گھڑی رونا دو چار گھڑی باتیں

اُمید ہو گئی کچھ گوشہ گیر سی دل میں
رہا کرے ہے تمنّا اسیر سی دل میں

اڑتا پھرے ہے نامہ گلی میں کسی طرف
دھڑ سے جدا پڑا ہے سر نامہ بر کہیں

یاد میاں اب دل میں تیرے وے باتیں نہیں آتی ہیں
کس مہوش کی چاہ کری جو آنکھیں بھی شرماتی ہیں
گھڑی گھڑی کی دے جو ادائیں جنہوں سے میں دکھ پاتا تھا
گلا اب اس کا مجھ سے نہ کیجے کیا وہ اپنا پاتی ہیں
خون ہمارے دل کا پیویں جس صورت سے چاہیں وہ
بس کب چل سکتا ہے ان سے جو انکھیاں مدماتی ہیں
پھنسواتیں ہیں دل کو میرے زلف میں ہر اک مہرو کے

آنکھیں میری مجھ سے یارو ناحق بیر بساتی ہیں
گئے وہ دن جو تلخ تمہارے منہ سے میٹھا لگتا تھا
سنو ہو پیارے اب وہ باتیں تم کو نہیں سہاتی ہیں
گھر سے باہر جلد نکل اب تیری خاطر ہے یہ حال
جانیں سب عشاق کی پیارے سینوں میں گھبراتی ہیں

ہزار قول کریں یہ نباہ کا سودا
مجھے بتاں کی محبت کا اعتبار نہیں

ہمیں تو ایک سے ہیں حسن میں صبیح و ملیح
کوئی ہو اپنا خریدار یہ نہ ہو وہ ہو

اگر نہیں اب کے میسّر ساقی و ابرِ بہار
جام دے اے دل برس اے دیدۂ خونبار تو

دے کے دل ہاتھ سر نہ دھر کر رو
زندگانی کی مت حلاوت کھو

اے ساکنانِ کنجِ قفس صبح کو صبا
سنتی ہی جائیگی سوئے گلزار کچھ کہو

گیا ہے جی تو نکل کب سے ہمصفیروں ساتھ
یہ مشت پر ہی رہے ہیں مرے اسیروں ساتھ
جہاں میں دیکھ کے طالع کی نارسائی کو
خیال ہے مجھے اب ہاتھ کی لکیروں ساتھ

عزّت و آبرو و حرمت و دین و ایماں
روؤں کس کس کو میں یارو کہ گیا کیا کیا کچھ
صبر و آرام کہوں یا کہ میں اب ہوش و حواس
ہو گیا اس کی جدائی میں جدا کیا کیا کچھ
والہ و شیفتہ و زار و حزین و مجنوں
اپنے عاشق کو کل اس نے نہ کہا کیا کیا کچھ
گریۂ شیشہ کبھی تھا تو کبھی خندۂ جام
ساقی اس دور میں تیرے نہ ہوا کیا کیا کچھ

سینہ قانون و غنا نالہ و دل ہے مضراب
نکلے ہے سازِ محبت سے صدا کیا کیا کچھ

بنا ہی اُٹھ گئی یارو غزل کے خوب کہنے کی
گیا مضموں دنیا سے رہا سودا سو مستانہ

گذشتہ حسن کا اب تک نشان باقی ہے
نہ ہوں فریفتہ کیونکہ کہ آن باقی ہے

ٹک ہمرہانِ قافلہ سے کہہ دے اے صبا
ایسے ہی گر قدم ہیں تمہارے تو ہم رہے

دل تو کیا گر طلبِ جاں تیرے من میں ٹھہرے
کون سا جی ہے پھر ایسا کہ بدن میں ٹھہرے

عبث لپیٹ سے لپٹا ہے دل کو مارِ سیاہ
صنم کی زلف مرے دل کو کاش ڈس چھوڑے

مری آنکھوں میں یارو اشک ایسا موج مارے ہے
کہ جیسے ساغر سیمیں میں صہبا موج مارے ہے

گل و بلبل کی بھی خوبو سے ہوں محرم اتنے
اس چمن میں بسر اوقات نہ ہونے پائی
منتظر باب اجابت پہ رہے شب کو نین
بے دماغی سے مناجات نہ ہونے پائی

شیشہ دلوں کو اپنے نہ واں جا کے پٹکیو
یارو بشہر سنگ دلاں سل زمین ہے

اگن نے تیرے برہ کے جب سے جھلس دیا ہے کلیجہ میرا
ہیئے کی دھڑکن میں کیا بتاؤں یہ کوئلا سا چٹک رہا ہے
جنھوں کی چھاتی سے پار برچھی ہوئی ہے رن میں وہ سورما ہیں
بڑا وہ ساونت من میں جس کے برہ کا کانٹا کھٹک رہا ہے
مجھے پسینا جو تیرے مکھ پہ دکھائی دے ہے تو سوچتا ہوں

یہ کیونکہ سورج کی جوت آگے ہر ایک تارا چھٹک رہا ہے
ہلوری یوں لے نہ اس کی بو لگ کے پھولوں کی پنکھڑی سے
تمہارے کانوں میں جس طرح سے ہر ایک موتی لٹک رہا ہے
کبھو لگا ہے نہ آتے جاتے جو بیٹھ کر ٹک اسے نکالوں
سجن جو کانٹا ہے تجھ گلی کا سو پگ سے میری کھٹک رہا ہے

سنا ہے مرغِ چمن کا تو نالہ اے ساقی
بہار آتی ہے بلبل خبر لگا کہنے

تھی سرد مہری اُس کی آبِ حیات دل کو
جھوٹے تپاک نے تو کچھ آگ سی لگائی!

علی کا نقشِ قدم ڈھونڈتا ہے یوں سودا
پھرے ہے باد صبا جوں سراغ میں گل کے

جب نظر اس کی آن پڑتی ہے
زندگی تب دھیان پڑتی ہے

دل کسی سے کہ جب پلٹتا ہے
دین و دنیا سے جی اچٹتا ہے

ہے مدّتوں سے خانۂ زنجیر بے صدا
معلوم ہی نہیں کہ دوانے کدھر گئے

نسیم ہے ترے کوچے میں اور صبا بھی ہے
ہماری خاک سے دیکھو تو کچھ رہا بھی ہے
جلے ہے شمع سے پروانہ اور میں تجھ سے
کہیں ہے مہر بھی جگ میں کہیں وفا بھی ہے
خیال اپنے میں گو ہوں ترانہ سنجاں مست
کراہنے کو دلوں کے کبھی سنا بھی ہے
ستم روا ہے اسیروں پہ اس قدر صیاد
چمن چمن کہیں بلبل کی اب نوا بھی ہے
سمجھ کے رکھیو قدم دشتِ خار میں مجنوں
کہ اس نواح میں سودا برہنہ پا بھی ہے

خاموش عندلیب چمن تجھ سے کیا ہے بحث
اپنا سخن تو مرغ گرفتار سانہ ہے

درد میرے استخواں کا کیا ترے دمساز ہے
اس قدر اے نے تری محزون کیوں آواز ہے

جس روز کسی اور پہ بیداد کروگے
یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کروگے

مژدہ یہ ہمصفیرو پہنچے تمہیں کہ تم بر
عرصہ تھا تنگ میرے نالہ کی حسرتوں سے
سو مجھ کو آسماں نے کنج قفس کو سونپا
اب چہچہے چمن میں کیجے فراغتوں سے

سودا وطن کو تج کر گردش سے آسمان کے
آوارہ عندلیبی ہے اتنی مدتوں سے
شوق اب زبان تک اپنی ہم شہریوں کی بھولا

نامہ جو اُس کو پہنچا ان بے مروتوں سے
کھولا اسے تو ہرگز اک لفظ بھی نہ سمجھا
قاصد سے پُوچھے معنی رمز و اشارتوں سے

بہار بے سپر جام یار گذرے ہے
نسیم تیر سی چھاتی کے پار گذرے ہے
شراب حلق سے ہوتی نہیں فرو تجھ بن
گلوئے خشک سے تیغ آبدار گذرے ہے
یہ آدمی ہے کہ سر مارتا پھرے ہے بسنگ
کہ باد تند سوئے کوہسار گذرے ہے

درخت خشک ہوں اس باغ میں خدا نہ کرے
کہ باغباں مرے احوال سے خبر پاوے

فکر معاش و عشق بتاں یاد رفتگاں
اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے

ساق سیمیں تری شب دیکھ کے گوری گوری
شرم سے شمع ہو جاتی ہے تھوڑی تھوڑی

سودا کے لئے بر سرِ بازار ہوئے ہم
ہاتھ اس کے بکے جس کے خریدار ہوئے ہم

وہ سمندر ہے کہ جس کا نہ کہیں پاٹ لگے
کشتی عمر مری دیکھئے کس گھاٹ لگے

چمن میں بلبلوں نے جب نبائے عشق کے چہکے
لگی سارے چمن کو آگ جتنے تھے کنول دہکے

میں دوانا ہوں صدا کا مجھے مت قید کرو
جی نکل جاوے گا زنجیر کی جھنکار کے ساتھ

نگاہِ ثانی

رنگ اڑتا ہے دیکھ اس کے تئیں لالہ رخاں کا
کرتی ہے بہار اس کے تو اب کام خزاں کا

وصل بھی ہو تو دل مرا غم کو نہ چھوڑے ہجر کے
یہ تو ہمیشہ ہے رفیق وصل ہے گاہ گاہ کا

تاراج چشمِ ترک بتاں کیوں نہ ہو یہ دِل
غارت کرے ہے ملک کو فرقہ سپاہ کا

کچھ میں بات بن رو ئے نہیں کی اس سے پہ ان نے
نہ پوچھا یوں سبب کیا ہے ترے ہر بار رونے کا

کیا میں کام نہ کرنے کا رات ساقی سے
خدا کرے کہ ہو خانہ خراب شیشے کا

عوض ہے دل شکنی کا بہت محال اے یار
جو شیشہ ٹوٹے تو کیجے جواب شیشے کا

چمن پہ ابرِ بہار سے اب شراب ٹپکے تو کیا عجب ہے
ہوا ہے رونا قبول ساقی جناب عالی میں میکشاں کا

مجھ حبیبِ ناتواں کے احوال کو نہ پوچھو
محروم ذبح سے ہوں مردود ہوں قفس کا

ایک دن تجھ سے سلگ اٹھتے نہ دیکھا کارواں
اے جرس حاصل کچھ اس فریاد بے تاثیر کا
توڑ کر بت خانے کو مسجد بنا کی تو نے شیخ
برہمن کے دل کی بھی کچھ فکر ہے تعمیر کا

حشم میں رات سن کہ ہر کسی کے پاؤں کا کھٹکا
اٹھا یا سر کو بالیں سے تو پھر دیوار سے ٹپکا

پہنچیں گے اس چمن میں نہ ہم داد کو کبھی
جوں گل یہ چاک جیب سلایا نہ جائے گا

غنچہ کو دل کے یاں ہے دم سرد سے شگفت
شرمندہ اس چمن میں نہیں ہیں نسیم کا

جوش طوفاں دیدۂ نمناک سے کیا کیا ہوا
دیکھ لے دنیا میں مشت خاک سے کیا کیا ہوا

ایک شب آ کوئی دل سوز نہ رویا اس پر
شمع تک گو ہماری سے جلی دور سدا

داغ تجھ عشق کا جھمکے ہے مرے دل کے بیچ
مہر ذرہ میں درخشاں نہ ہوا تھا سو ہوا

سنا جب انس تھا ہرنوں کو صحرا بیچ مجنوں سے
کیا شہری غزالوں کے تئیں سودا نے رام اپنا

بلبل نے جسے جا کے گلستان میں دیکھا
ہم نے اسے ہر خار بیابان میں دیکھا
اے زخم جگر سودۂ الماس سے خو کر
کتنا وہ مزہ تھا جو نمکدان میں دیکھا

اسباب دین و دنیوی کب تھا خیال میں
تیرا ہی دھیان تا بدم واپسیں رہا
تاب کس کو ہے کہ تیرے در سے آگے جا سکے
جو ترے کوچے میں آیا سر ٹپکتا ہی رہا

کچھ میں ہی نہیں ہوں، ایک عالم
اس کے لئے یاں خراب دیکھا
کچھ ہو وے تو ہو عدم میں راحت
ہستی میں تو ہم عذاب دیکھا

طوفاں بھرے تھا پانی جن آنکھوں کے سامنے
آج ابر اُن کے آگے زمیں کر کے تر چلا
سوداؔ کہے تھا یار سے یک مُو نہیں غرض
اودھر کھلی جو زلف ادھر دل بکھر چلا

صد حرف آرزو ہے زباں پر مری و لے
چاہوں جو تجھ سے ایک کہوں میں دہن کجا

خیال ان انکھڑیوں کا چھوڑ مت مرنے کے بعد از بھی
دلا آیا جو تو اس میکدے میں جام لیتا جا

حال دل سے مرے جب تک وہ خبردار نہ تھا
جز دم سرد کوئی محرم اسرار نہ تھا
پیار و اشفاق و وفا مہر و محبّت الطاف
دل کو جس روز لیا کونسا اقرار نہ تھا

وہ ہم نہیں جو کریں سیرِ بوستاں تنہا
بہشت ہو تو نہ مونہہ کیجے باغباں تنہا

کیا کیا دلا کے غیرت رکھا ہیں باز دل کو
ورنہ نہ سہتی باتیں تیری ہیں سہ گیا تھا

جو ذکر بعد مرے ہوگا جان نثاروں کا
کروگے یاد مجھی کو وہ اک دوانا تھا

آہ و فغاں کی آج جو آتی نہیں صدا
شاید ترا جہان سے بیمار اوٹھ گیا

ہوں تو چراغ راہ ہنر زیرِ آسماں
لیکن خموش ہو کے سحر شام رہ گیا

وہم غلط کار نے دل خوش کیا
بس یہ نہ جانے وہ نظر کر گیا

جا ہی بھڑ اتھا اس صفِ مژگاں سے دل مرا
پر زخم یہ اٹھائے کہ بس چور ہو گیا

کام آئی کوہکن کی مشقت نہ عشق میں
پتھر سے جوئے شیر کے لانے نے کیا کیا

ٹک دوڑ تک اپنے آمرے ناصح کا حال دیکھ
میں تو دوانہ تھا پہ سیانے نے کیا کیا

ہچا ہوں میں کس طرح یہ زمانے کی دوستی
اوروں سے دوست ہو کے زمانے نے کیا کیا

انہتا عیش جہاں کی جو تو دیکھا چاہیے
بزمِ مستاں پہ نگہ غور سے کر آخرِ شب

کس نے چمن میں آن کے آنکھیں لڑائیاں
نرگس کا اڑ گیا ہے مری طرح رنگ و خواب

مجھ اشک میں جوں ابر اثر ہوئیگا یا رب
قطرہ کبھی میرا بھی گہر ہوئیگا یا رب

اگر نہ چرخ دنی ہو تو کریقین سودا
گہر ہو بر کف دریا حباب در تہ آب

گئی ہے سر سے گذر موج اشک آنکھوں کی
مجھے یہ لے گئی خانہ خراب در تہ آب

بزم غم خون جگر پہ مرے مہمان تھی رات
آہ سرگرم مرے شمع شبستان تھی رات

کارگر ہو گا ترا افسوں یہ باور ہے تجھے
اس پری پہ اے دل وحشی دوانا ہے عبث

رہتے تھے ہم تو شاد نہایت عدم کے بیچ
اس زندگی نے لا کے پھنسایا ہے غم کے بیچ

بعد از شباب ہوں نہ تری انکھیاں نہ بادہ مست
ہوتا ہے زور کیفیت شراب کہن کے بیچ

کیا قافلۂ عمر سبکرو ہے کہ جس میں
چپا ہے جو سنے سامعہ آوازِ درا ہیچ
شاہاں سے سوال اپنا عزت شکنی ہے
کونین تلک ورنہ ہے پیشِ فقرا ہیچ

بلبل کو اس چمن میں سمجھ کر ٹک آشیاں
صیاد لگ رہا ہے تیری گھات بے طرح
آہ کس سرو میں قمری ہے قدِ یار کی طرح
نالہ کرتی ہے تو میرے دِل افگار کی طرح

لُطفِ نشاطِ بادہ و حسنِ ظہورِ صبح
مل کر ہوا ہے خلق دو جان سرورِ صبح
لہرائی ہے نسیم سحر کیا ہے ساقیا

گویا ہے موج بادہ بجام بلورِ صبح
گذرے ہے چشم تر سے مری یوں وہ سیم تن
جیسے کنارِ بحر سے ہوئے عبورِ صبح
سودا اکھوں ہیں یار سے کیا جس کے سامنے
اڑ جائیں ہیں حواس برنگ طیورِ صبح

کوچ اس منزل سے یاروں کا نہیں ہے جائے خیر
ہم بھی جا پہنچیں گے آخر پاس اس کے دیر و زود

میں دیکھتا ہوں جیسے ہے وہ آپ ہی نالاں
تمہاری کیجے کس پاس اسے بتان فریاد
برنگ نے نفس عجز تا مدد نہ کرے
کبھی نہ کر سکے تنہا یہ ناتواں فریاد

ہوا ہے داغ مرا دل انار کے مانند
جھڑے ہے آنکھ سے آنسو شرار کے مانند

ہے ایک پاٹ ہے دامن کا تختۂ گلزار
رواں ہے چشم سے خوں آبشار کے مانند
خبر نہیں ہے مجھے ترک چشم نے کس کے
لیا ہے لوٹ مرا دل دیار کے مانند

زعم میں اپنے تو میں بھی ہوں سلیماں لیکن
نام میرا منتسم ہے نگیں میرے پر

نہ دیکھی خوشدلی جز یک تبسم ہم نے غنچے میں
ہوا سے اس چمن کے ہے دلا ترک ہوس بہتر

دینے کو ملک سلیماں کے بلایا مجھ کو
پر قدم میں نہ رکھا دل کے نگہ سے باہر

داغ مت کھائیو تیں عشق کا ہم کہتے تھے
کیوں دلا کی ہے نہ اس گل نے بہار آخر کار

ہو جلوہ گر شتاب تو اے نورِ بزمِ عشق
آنسو گلوے شمع کے ہیں ہار تجھ بغیر

جوش سے میرے جنوں کی کیا خوش آتی ہے بہار
پیرہن میں گل کے نئیں پھولی سماتی ہے بہار
کس کی آنکھوں سے کہو آئی ہے مستی سیکھ کر
اس برس نرگس پہ کیا دھومیں مچاتی ہے بہار

خرمی پھرتی ہے یوں دل پہ مرے غم سے دُور
جوں پھرے اہلِ طرب خانۂ ماتم سے دُور
بلبل کو کیا تڑپتے ہیں دیکھا چمن سے دُور
یارب نہ کیجیو تو کسی کو وطن سے دُور
پوچھے بھی وہ تو ہم نہ کہیں آرزوئے دل
وہ بات کیوں کہیں جو ہو اپنے دہن سے دُور

آج کون آیا تھا گلشن میں خدا جانے کہ ہے
باغباں کا دل نزار و بلبل گلزار زار

فریاد عندلیب کو پہنچا چمن میں گل
آیا نہ میرے پاس مرا دادرس ہنوز

تیری دوری سے عجب حال ہے اب سودا کا
میں تو دیکھا نہیں ایسا کوئی بیمار ہنوز

نے چین روز وصل نہ شب ہجر کی قرار
کیا جانے کیا ہے اپنے دل زار کی ہوس

ابر اوس کو بجھاتا ہے وہ بجھتی نہیں سودا
دی لالۂ خود رو نے یہ کہسار کو آتش

زندگی کیوں نہ ہووے مجھ پہ شاق — یار بے اعتنا و دل مشتاق
غم نہیں اس کی بیوفائی کا — کرے ترک وفا نہ ہم سے فراق

کون ہے عارف کو یاں دعویٰ انا الحق کا نہیں
یہ ترانہ ختم لیکن ہو چکا منصور تک

کب سپاہی کام پہ آقا کے اب دیتا ہے جی
بھوک سے کرتا ہے ہو کر زندگی سے سیر جنگ

ابھی جھپکی ہے ٹک اے شور قیامت یہ پلک
صبح کا وقت ہے ظالم نہ خلل خواب میں ڈال
جو تو سیر چمن میں ساتھ ہوتا ہے تو شادی سے
سماتا واں نہیں جوں غنچہ میرے پیرہن میں دل

کب سے اے سودا شراب اس بزم میں پیتے ہیں یار
تو نے اے کم ظرف کی پہلے ہی پیمانے میں دھوم

لے دیدۂ تر جدھر گئے ہم ڈبرے جو تھے خشک بھر گئے ہم
تیرا جو ستم ہے اس کو تو جان اپنی سی تو خوب کر گئے ہم
ہوگی نہ کسی کو یہ خبر بھی اس بزم سے آ کدھر گئے ہم

ہیں صفائے بادۂ و دردِ تہ پیمانہ ہم
نورِ شمعِ مجلس و سوزِ دلِ پروانہ ہم

یُمن سے پانوں کی لغزش کے کیا اے شیخنا
دیر سے اٹھتے ہوئے کل سجدۂ مستانہ ہم

دشمن کے سر بولا گئے جب یار کے کاشانہ ہم
جی میں آتا ہے کریں اس گھر کو خلوت خانہ ہم

دوستی کا غیر کے کیا ذکر اس دل میں کہ دوست
آشنائی میں ترے ہیں آپ سے بیگانہ ہم

بیٹھا نہ کوئی چھانوں نہ پایا کسی نے پھل
بے برگ و بر نہیں کوئی ایسا شجر کہ ہم

خانہ پرورد چمن ہیں آخر اے صیاد ہم
اتنی رخصت دے کہ ہو لیں گل سے ٹک آزاد ہم

اے گل صبا کی طرح پھرے اس چمن میں ہم
پائی نہ بوِ وفا کی ترے پیرہن میں ہم

چمن میں وقت رخصت صبح کو میں کیا کہوں تجھ سے
روئی ہے گل کی چھاتی سے لپٹ کر کس قدر شبنم
مجھے وضع جہاں اس رشک سے محفوظ رکھتی ہے
بہار آخر ہے اک پل میں کہاں پھر گل کدھر شبنم

شرر سے شعلہ سے شرر اک پل میں گرتے ہیں
بھلا ٹک غور کر دیکھو ہے کیا کیا چھند آتش میں

تو اس چمن میں ہے گل پہ نہیں ہیں ہم شبنم
وگرنہ رو رو گلے سے ترے لپٹ جاویں

یار آزردہ ہوا رات جو مے نوشی میں
کیا ہوا ہم سے خدا جانیے بیہوشی میں

بات آوے نہ تو چپ رہ کہ گماں کے نزدیک
سو طرح کا ہے سخن پردہ خاموشی میں

گیا گلا صبا دسے ہم کو یو نہیں گذرے ہے عمر
اب اسیر دام ہیں تب تھے گرفتار چمن

زہد کو چاہیئے ہے زور تو عصیاں کو زر
میں بھی یوں ہی بسر اوقات کروں یا نہ کروں
کیوں میں تسکین دل اے یار کروں یا نہ کروں
نالہ جا کر پس دیوار کروں یا نہ کروں

ہجر اور وصل سے کچھ کام نہیں ہے مجھ کو
بات وہ کیجے کہ ٹک دل کو ہو تسکین جس میں
کار فرما جو ہمیں پوچھے تو کیا دینگے جواب
وہ کیا کام نہ دنیا ہوے نے دیں جس میں
لطف کیا رکھے ہے اس باغ کی سیر اے سودا
شاخ پر دیکھنے دے گل کو نہ گلچیں جس میں

گدا دستِ اہلِ کرم دیکھتے ہیں
ہم اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں

غرض کفر سے کچھ نہ دیں سے ہے مطلب
تماشائے دیر و حرم دیکھتے ہیں

آیا تھا کیوں عدم سے کیا کر چلا جہاں میں
یہ مرگ و زیست تجھ بن آپس میں ہنسیاں ہیں

اس واسطے کہ ہیں یہ وحشی نکل نہ جاویں
آنکھوں میں میرے مژگاں ڈوروں سے کستیاں ہیں

جو بات یہ کرتا ہے تم غور کرو یارو
کچھ کشف کے اس میں سے عنوان نکلتے ہیں

نے فکر ہے دنیا کی نہ دین کا متلاشی
اس ہستی موہوم میں کس کام کا ہوں میں

مطلوب دعا حق میں نہیں اپنے کسو کی
طالب لبِ محبوب سے دشنام کا ہوں میں

زندگی محبوب کیا کیا اس میں ہیں محبوبیاں
بیوفائی نے پہ اس کی دین مٹا سب خوبیاں
عشق یا پیغمبر وقت اس کو یارو کیا کہوں
دل تو ایوبی ہوا آنکھیں ہوئیں یعقوبیاں

وہ رہا دستِ تاسف کے تئیں ملتا ہوا
جن نے وہ انکھیاں خمار آلودہ لیاں دیکھیاں
ہائے جس دن سے گیا ہو کہ خفا وہ تند خو
غنچۂ دل کی کھلی پھر یں نہ کلیاں دیکھیاں

پاس ناموس مجھے عشق کا ہے اے بلبل
ورنہ یاں کونسا انداز فغاں ہے کہ نہیں
دلا میں پیتے ہی پیتے پیوں گا عشق کی مے
یہ جام زہر بھرا ہے پیارے ہے کچھ انگبیں تو نہیں

سوچوں ہوں اپنے تئیں جوں سخن رفتہ زیاد
گاہ بیگاہ اگر آپ میں آجاتا ہوں

کرتا ہے جا کے گل کی تسلّی چمن میں تو
خونِ جگر میں میں بھی تو دامن کشیدہ ہوں

یاد کر باغ میں تجھے ساقی
روز ہم روئے بیٹھ تاک کی چھانوں
تم نے ہم سے بہت کی کج غلطی
کبھی تو ہووے گا ہمارا داؤں

چھری تلوار یک دیگر گل و بلبل ہیں گلشن میں
تمہاری بیچ کہو دونوں میں کس سے آنکھڑیاں لڑیاں

جوں برف ہو گئے ہیں خنک اب بتانِ ہند
ان سے تو بلکہ گرم ہیں کابل کی بولیاں

نہ اشک آنکھوں سے بہتے ہیں نہ دل سے اٹھتی ہیں آہیں
سبب کیا کارواں درد کی مسدود ہیں راہیں

سوداؔ خدا کے واسطے کر قصّہ مختصر
اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانے میں

ساقی ہے اک تبسّم گل فرصت بہار
ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں
صحبت میں تیری آن کے جوں شیشۂ شراب
خالی کروں میں دل کے تئیں بیٹھ کر کہیں

سوداؔ رہے گی آہ اگر آتی متصل
اندیشہ ہے مجھے نہ نکل جائے دم کہیں

ریختے کہ کہ ہوا دوانا سوداؔ تو پھر عجب نہیں
عشق کی باتیں افلاطونی پلیں مت بورانی ہیں

اس دل میں گو ہماری الفت نہیں رہی اب
اپنی طرف سے اے دل ہم تو بھلا نبا ہیں

چاہ کے غرق تجھے ہے یہ گمان تو نے ہیں
ڈوبے گرداب محبت کے کہاں تر تے ہیں

یہ میں بھی سمجھوں ہوں یارو وہ یار یار نہیں
کروں میں کیا کہ مرا دل پہ اختیار نہیں
عبث تو سر کی مرے ہر گھڑی قسم مت کھا
قسم خدا کی ترے دل میں اب وہ پیار نہیں
جہاں کے بیچ غم دل کہوں سو کس سے کہوں
سوائے غم کے مرا کوئی غم گسار نہیں

ٹکڑے تو ابھی لعل کے دل بیچ دھرے ہیں
ہم نے تو ابھی موتی ہی آنکھوں میں بھرے ہیں

ایک عالم کو زمانے نے دیا کیا کیا کچھ
پر کبھو میں نہ کہا اس سے کہ دوراں مجھکو

آلودہ ز قطراتِ عرق دیکھ جبیں کو
اختر پڑے جھانکیں ہیں فلک پر سے زمیں کو

سبب آزار دل میرے کا ہے بے الفتی اس کی
نہ اپنے سے محبّت ہے نہ مہر غیر ہے اس کو

حسن فیاض ہے گل کا کہ سحر پنجۂ مہر
جس کے دامن سے چنے ہے گہر شبنم کو

طرہ کی کھل گئی ہے گرہ ورنہ اے نسیم
شور دماغ مرغ چمن گل کی بو نہ ہو

دلدار اس کو خواہ دل آزار کچھ کہو
سنتا نہیں کسو کی مرا یار کچھ کہو

غمزہ ادا نگاہ تبسم ہے دِل کا مول
تم بھی اگر ہو اس کے خریدار کچھ کہو

ہر آن آ مجھی کو ستاتے ہو ناصحو
سمجھا کے تم اسے بھی تو یک بار کچھ کہو

تجھ کو فقط چراغ شام ڈھونڈھے نہیں ہے گھر بگھر
پھرتی ہے بادِ صبح گاہ خانہ بخانہ کو بہ کوُ

بارہا دل کو میں سمجھا کے کہا کیا کیا کچھ
نہ مری سن کے کبھو آپ بکا کیا کیا کچھ
دوستو حق میں ترقی و تنزل اپنے
کیا کہیں ہم کو زمانہ سے ہوا کیا کیا کچھ

سب خواب سے خلق اٹھے سن شور قیامت کو
طالع مرے کروٹ لیں ایسے نہیں خوابیدہ

یاں محفل شادی بھی غم سے نہ جدا دیکھی
کیا شیشۂ مے رویا جب نے ہوئی نالیدہ

اے آتش گل تو ہی کر خس کو مرے اپنا
ہر چند میں گلشن میں ہوں سبزۂ بیگانہ

اکھٹا ہوا نہ قافلہ دنیا میں اس سوا
جو یاں سے اٹھ چلا سو گیا درد و غم کے ساتھ

لٹی مے اُٹھ گیا ساقی مرا بھی پر ہو پیمانہ
الٰہی اس طرح دیکھوں میں کن آنکھوں سے میخانہ

تجھ کو یوسف کی خبر ہے کہ نہیں اے یعقوب
بک گیا مصر میں وہ روسے نکو ہاتھوں ہاتھ

بولا وہ جسے تیری تصویر نظر آئی
یہ خوابِ زلیخا کی تعبیر نظر آئی

مجھ چشم کی جھڑیوں نے ڈبو ماری ہے اک خلق
کیا دشمنِ آفاق یہ برسات ہوئی ہے

نہ میں جہاں میں ہوں تیری تو آرزو یہ ہے
نباہ مجھ سے وفا کا ہے ورنہ تو یہ ہے

ہوئے نہ ہم سے جہاں میں تو گو نہ ہوں اے یار
تو رہ جہاں میں کہ تجھ سے جہان باقی ہے

غم سے ہوئی ہے کاروائی یہ دل کی بند
چلتے ہوئے اب اشک ہی آنکھوں سے تھم رہے

جب اس چمن سے چھوڑ کے ہم آشیاں چلے
اک ہم صفیر نے بھی نہ پوچھا کہاں چلے

جاتے ہیں لوگ قافلہ کے پیش و پس چلے
دنیا عجب سرا ہے جہاں آ کے بس چلے

کہیو صبا سلام ہمارا بہار سے
ہم تو چمن کو چھوڑ کے سوئے قفس چلے

اے غنچہ آنکھ کھول کے ٹک تو چمن کو دیکھ
جمعیت دلی پہ ترے پھول ہنس چلے

تیرے سخن کو میں بسر و چشم ناصحا
مانوں ہزار بار اگر دل سے بس چلے

کیا کیا تھے چاؤ دل میں جب آئے تھے عدم سے
کھلتے ہی آنکھ یارو پالا پڑا ہے غم سے

صحبت شعر و بکف جام و صراحی در دست
اس سوا سودا کو کچھ کام نہیں دنیا سے

بے چین جو رکھتی ہے تمہیں چاہ کسو کی
شاید کہ ہوئی کارگر اب آہ کسو کی

تیرے شوریدہ کو جس دن کہ زمیں کو سونپا
زلزلہ کو بھی خدا وہ نہ للک دکھلاوے

مَیں ایک آن میں دکھلاؤں یہ طلسم جہاں
جو قید تن سے فلک مجھ کو یک نفس چھوڑے

مجرم ہوں مَیں تو کہہ دو مکافات کے لئے
منہ میں خدا نے دی ہے زباں بات کے لئے

وہ رات وصل دوست کی یارب نہ ہو نصیب
بھر عمر بیٹھے روئیے جس رات کے لئے

دل نہ دے گا وہ کسو کو تو رہے گا یہ غم
کہ مرے دل کی مکافات نہ ہونے پائی

صبح یوں نکلے ہے وہ گھر سے کہ جوں خط شعاع
جیب کا بکھرا ہوا چھاتی پہ ہر اک تار ہے

خو سے تیرے نہیں پاتا جو کہیں جائے قرار
دامن شعلہ میں لیتا ہوں پناہ ہے گاہے

ہے اب جہاں میں بدگہری کس ہنر سے کم
عیب اس زمانہ میں جو کہو سو ہنر میں ہے

ہم آج ایک صنم میں غرور دیکھا ہے
نظیر کبر خدا کا ظہور دیکھا ہے

نشہ کو ہرگز حقیقت کے نہ پہنچے گا کوئی
جب تلک اے یار خالی عمر کا پیمانہ ہے

دلا تو یار کو شمس و قمر لگا کہنے
وہ شعلہ طور کا ہے تو شرر لگا کہنے

شکوہ ہے جور و جفا کا ترے کس کافر کو
مجھ پہ گذرے ہے سو میری ہی وفاداری سے

منت سماجت الحاح سب کچھ ۔ کیئے پہ اپنی
یارو کسی طرح سے امید بر نہ آئی

مآل مردم ماضی و حال و استقبال
سنا تو ایک سی کچھ داستان ہے سب کی

پھرتے ہو باغ سے تو پکارے ہے عندلیب
صبح بہار گل پہ شب تار کر چلے

گھڑی گھڑیال کی سن سن کے میرا جی دہلتا ہے
چلی آتی ہے وہی رات جوں جوں دن یہ ڈھلتا ہے

جھیل لیتے ہیں عاشق اے فرہاد
جس کے سر جیسی آن پڑتی ہے
بات اس دل کے درد کی یارو
گفتگو میں نہ آن پڑتی ہے

عشق سے تو نہیں ہوں میں واقف
دل کو شعلہ سا کچھ لپٹتا ہے

بلبلو مجھ کو نہ تکلیف کرو نالے کی
ڈوب جاوینگے لہو میں گل و گلزار گئی

مستی سے اس نگاہ کی ہے محتسب خبر
دنیا تمام بزم خرابات ہو گئی

مت پوچھ یہ کہ رات کٹی کیونکہ تجھ بغیر
اس گفتگو سے فائدہ پیارے گذر گئی

اب کے بھی دن بہار کے یونہی چلے گئے
پھر پھر گل آچکے پہ سجن تم بھلے گئے

تیرے ان الفتوں کے زمانے کدھر گئے
کیا جانئے کہاں ہیں نہ جانے کدھر گئے

گرمی کسو طرح نہیں بازارِ عشق میں
سودا متاعِ دل کے تئیں آگ دیجئے

چڑھ گیا نظروں کوئی شہ سوار
قطرۂ اشک مرا گلگون ہے

اسیری پر مرے ناحق یہ دل بیداد کرتا ہے
قفس میں ہم نوایانِ چمن کو یاد کرتا ہے

ترا غرور مرا عجز تا کجا ظالم
ہر ایک بات کی آخر کچھ انتہا بھی ہے

نہ پوچھو مجھ سے میرا حال ٹک دنیا میں جینے دو
خدا جانے میں کیا بولوں کوئی غماز کیا سمجھے

اک گل سے بوئے وفا کی جو آتی ہے اے نسیم
ہر صبح اس چمن کی ہو شام قفس مجھے

ناتوانی بھی عجب کچھ ہے کہ گلشن میں نسیم
نت لئے پھرتی ہے دوش اوپر برنگِ بُو مجھے

حسرت و داغ و الم درد چلا میرے ساتھ
ہجر تیرے نے کیا قافلہ سالار مجھے

اس قدر اب کی ہوا مست ہے ویرانے کی
کسی لڑکے کو نہیں سدھ کسی دیوانے کی

دن رات ہر پلک نے میری جھڑی لگائی
کیا جانے آنکھ تجھ سے میں کس گھڑی لگائی

گل پھینکے ہے اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ بر انداز چمن کچھ تو ادھر بھی
تنہا ترے ماتم میں نہیں شام سیہ پوش
رہتا ہے سدا چاک گریبانِ سحر بھی

ہزار حرف شکایت کا دیکھتے ہی تجھے
زباں پہ شکر ہو بے اختیار گذرے ہے

بے خوابی سے مرتا ہے شب ہجر میں سودا
اب کہنے کو افسانہ کوئی نوحہ گر آوے

جو اٹھ نہ سکے تری گلی سے
رہنے دے کہ تا غبار ہووے

بھر نظر تجھ کو نہ دیکھا کبھی ڈرتے ڈرتے
حسرتیں جی کی رہیں جی ہی میں مرتے مرتے

کیا کیا ملے لیلے منشاں خاک میں سودا
گو اپنے بھی محبوب کی دیکھی نہ جوانی

نگاہِ ثالث

مخزن نکات (قائم)

موج آتش ہے سیل آنکھوں سے
شاید اب دل کا آبلہ پھوٹا

سودا اسے کہا میں نے دل میں بھی کسی کو دوں
وہ کر کے بیان اپنا رو داد بہت رو دیا

خرمی پھرتی ہے یوں اس دل پر غم سے دور
جوں پھریں اہل طرب خانہ ماتم سے دور

یاروں نے سن لیا ہے اسیری کے نام کو
پہچانتے ہیں یہ نہ قفس کو نہ دام کو

نکات الشعرا (میر)

آہ کس طرح تری راہ میں گھیروں کہ کوئی
ستدِ رہ ہو نہ سکے عمر چلی جاتی کا

سودا ہوئے جب عاشق کیا پاس آبرو کا
سنتا ہے اے دوانے جب دل دیا تو پھر گیا

موج آتش ہے سیل آنکھوں کا
دل کا شاید کہ آبلہ پھوٹا

مبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر
میرے لہو کو تو دامن سے دھو ہوا سو ہوا

ترا جیو مجھ سے نہیں ملتا مرا دل رہ نہیں سکتا!
غرض ایسی مصیبت ہے کہ میں کچھ کہہ نہیں سکتا

سودا سے میں یہ پوچھا دل میں بھی دوں کسی کو
وہ کر کے بیان اپنی روداد بہت رویا

ہندو ہیں بت پرست مسلماں خدا پرست
میں پوجتا ہوں اس کو جو ہو آشنا پرست

منعم نہ مر بنائے عمارت کی فکر میں
یہ سب حویلیاں تھیں جہاں تک ہے اب اجاڑ

انکار قتل سے تو کرے ہے سجن ہنوز
میلا نہیں ہوا ہے ہمارا کفن ہنوز

رنگِ گل بے طرح دھکے ہے سن اے ابرِ بہار
آشیاں میرا چھڑک لگتی ہے اب گلشن کو آگ

تسلی اس دوانے کی نہ ہو جھولی کے پتھروں سے
اگر سودا کو چھیڑا ہے تو لڑکو مول لو پھڑیاں

نہ غنچے دل کے کھلتے ہیں نہ نرگس کی کھلی کلیاں
چمن میں لے کے خمیازہ کسی نے انگڑایاں ملیاں

غیر کے پاس یہ اپنا ہی گماں ہے کہ نہیں
جلوہ گر یار مرا ورنہ کہاں ہے کہ نہیں
جرم ہے اس کی جفا کا کہ وفا کی تقصیر
کوئی تو بولو میاں منہ میں زباں ہے کہ نہیں

بہار باغ ہو مینا ہو جام صہبا ہو
ہوا ہو ابر ہو ساقی ہو اور دنیا ہو
روا ہے کہہ تو بھلا اے سپہر نا انصاف
ریا سے زہد چھپے راز عشق رسوا ہو

کعبہ کی زیارت کو اے شیخ میں پہنچوں گا
مستی سے مجھے بھولی جس دن رہ مے خانہ

مت ہنس مرے رونے پر آماں میں کہتا ہوں
ٹپکے ہے ابھی کوئی قطرہ اثر آلودہ

کس قدر اب کے ہوا مست ہے ویرانے کی
کسی لڑکے کو نہیں سدھ کسی دیوانے کی

مرجاں کا نخل ہوں نہ پھلوں برگ و بار سے
ٹپکے ہمیشہ خون مری شاخسار سے

تذکرۂ ریختہ گویاں (گردیزی)

پردے کو یقیں کے در دل سے اٹھا دے
کھلتا ہے ابھی پل میں طلسمات جہاں کا
سودا جو کبھی گوش سے ہمت کے سنے تو
مضمون یہی ہے جرس دل کی فغاں کا
ہستی سے عدم تک نفس چند کی ہے راہ
دنیا سے گذرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

سجن میں رات سن کر ہر کسی کے پانوں کی آہٹ
اٹھایا سر کو بالیں سے تو پھر دیوار سے پٹکا

اندام گل پہ ہو نہ قبا اس مزے سے تنگ
جیوں خوش چھبوں کے تن پہ مسکتی ہیں چولیاں

قیس و فرہاد کے مرنے سے تو جگ میں اب تک
دشت میں خاک بسر روتے ہیں کہسار ہنوز

نیم جاں ہیں یہ تری چشم کے بیمار کئی
مر گئے خنجر مژگاں کے گرفتار کئی
تیرے بازار میں اب کیوں کہ نہ بگڑے سودا
ایک یوسف نظر آتا ہے خریدار کئی

قاتل ہماری نعش کو تشہیر ہے ضرور
آئندہ تا کوئی نہ کسو سے وفا کرے

پروانے رات شمع سے اتنے جلے کہ بس
خاکستر اُن کی لے کے صبا دوش پر گئی

شیریں کی بات میں نہ کہوں ورنہ بارہا
لیلیٰ جدھر تھی وادیٔ مجنوں ادھر گئی

تذکرۂ میر حسن

کس گلی دیکھ گئے میں اس کو پکارا نہ گیا
مڑ کے ٹک دیکھنے کا ننگ گوارا نہ کیا

رقیب اور میں ہوں زیرِ آسماں یک جان دو قالب
مخاطب تم بہ لفظِ جاں ہم دونوں کے ہوتے ہو

کس کس طرح کی دیکھیں اس باغ کی فضائیں
کیدھر گئے وہ ساقی وہ ابر وہ ہوائیں

یاں نہ ذرہ ہی چمکتا ہے فقط گرد کے ساتھ
جلوہ گر نور ہے خورشید کا ہر فرد کے ساتھ

صبح دم آج چمن میں یہ لب جو سودا
بیٹھا اک شعر یہ پڑھتا تھا نپٹ درد کے ساتھ

دل کو چاہا تھا کہ خالی کروں مانند حباب
ہو گئی جان ہوا اک نفس سرد کے ساتھ

تنزّل میں بھی ہم ہرگز ترقی سے نہ کم ہوتے
جو بنتے کوہ سے پتھر تو پتھر سے صنم ہوتے

ڈرتے ڈرتے جو ترے کوچے میں آ جاتا ہوں
صید خائف کی طرح رو بہ قفا جاتا ہوں

سوچوں ہوں اپنے تئیں جوں سخن رفتہ زیاد
گاہ بے گاہ اگر آپ میں آ جاتا ہوں

تذکرہ ہندی (مصحفی)

ٹک دیکھ صنم خانۂ عشق آن کے اے شیخ
جوں شمع حرم رنگ چمکتا ہے بتاں کا

اس گلشنِ ہستی میں عجب دید ہے لیکن
جب چشم کھلی گل کی تو موسم ہے خزاں کا

جس نے نہ دیکھی ہو شفق صبح کی بہار
آکر ترے شہید کو دیکھے کفن کے بیچ

افعی کی یہ طاقت ہے کہ اس سے بسر آوے
وہ زلفِ سیہ اپنی اگر لہر پہ آوے

جب اپنے بند قبا تم نے جان کھول دیئے
صبا نے باغ میں جا گل کے کان کھول دیئے

عارض پہ حسن خط سے دمک کیا ہے نور کی
یہ دود لڑ رہا ہے تجلّی سے طور کی

○

(۲)

رُباعیات

ایوان عدالت میں تمہارے اے شاہ
کیا ظلم کو ہے دخل عیاذاً باللہ
شیشے کا جو واں طاق سے رپٹے ہے پاؤں
پتھر سے نکلتی ہے صدا بسم اللہ

نادیدنی از بس کہ ہے روئے عالم
ہے کفر ملاقات جو کیجے باہم
کرتا ہوں کہیں جانے کا جس وقت کہ عزم
ور د آن کے سودا مرے پکڑے ہے قدم

شیشے سے جو کوہکن نے سر کو پٹکا
شیریں کا یہ سن کے جان تن سے پھٹکا
دے درد کی داد کیا ہمارے کوئی
ناخن کا جگر پہ کب سُنے ہے کھٹکا

کیا زلف میں اس شوخ سے تھی دبکی صبح
جوں شام سے ہوتی ہے کسی شب کی صبح
جب زلف کو میں ہاتھ لگایا اودھر
ہمسایہ پکارا کہ ہوئی کب کی صبح

کیا جانئے بسا ہے آج کس کے جا کر
آتی نہیں نیند مجھ کو تنہا پا کر
جی میں ہے نہ اُٹھیے تا بہ صبح محشر
اس رات کو سوئیے کچھ ایسا کھا کر

کل آ کے جنھوں نے بے وفا سے پا کر
میں ترک کیا تھا عشق قسمیں کھا کر
سن آج کی بات کیا کہیں گے مجھ کو
کس منہ سے دکھاؤں گا منہ ان کو جا کر

سوداؔ شعرا میں ہے بڑائی تجھ کو
تشریف سخن عرش سے آئی تجھ کو
عالم تجھے اس فن میں پیمبر سمجھا
پوجا جہلا نے بخدائی تجھ کو

سرمایۂ عیش کامرانی تو ہے
آرام دل و مونس جانی تو ہے
گر تو ہی نہ آوے تو یہ جینا کس کام
میری تو مرادِ زندگانی تو ہے

افسوس ہماری عمر روتے گذری
نت دل سے غبار غم ہی دھوتے گذری
دیکھا نہ کبھی خواب میں اپنا یوسف
ہر چند تمام عمر سوتے گذری

۳

تضحیک روزگار

ہے چرخ جب سے ابلق ایام پر سوار
رکھتا نہیں ہے دست عناں کا بیک قرار
جن کے طویلے بیچ کوئی دن کی بات ہے
ہرگز عراقی و عربی کا نہ تھا شمار
اب دیکھتا ہوں میں کہ زمانے کے ہاتھ سے
موچی سے کفش پا کو گٹھاتے ہیں وہ ادھار
تنہا ولے نہ دہر سے عالم خراب ہے
خست سے اکثروں نے اٹھایا ہے ننگ و عار
ہینگے چنانچہ ایک ہمارے بھی مہرباں
پاوے سزا جو اون کا کوئی نام لے نہار
نوکر ہیں سو روپے کے دیانت کی راہ سے
گھوڑا رکھیں ہیں ایک سو اتنا خراب و خوار

نے دانہ و نہ کاہ نہ تیمار نے شبیس
رکھتا ہو جیسے اسپ گلی طفل شیر خوار
ناطاقتی کا اس کے کہاں تک کروں بیاں
فاقوں کا اوس کے اب میں کہاں تک کروں شمار
مانند نقش نعل زمیں سے بجز فنا
ہرگز نہ اٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار
اس مرتبہ کو بھوک سے پہنچا ہے اس کا حال
کرتا ہے راکب اوس کا جو بازار میں گذار
قصاب پوچھتا ہے مجھے کب کروگے یاد
اُمیدوار ہم بھی ہیں کہتے ہیں یوں چمار
جس دن سے اس قصائی کے کھونٹے بندھا ہے وہ
گذرے ہے اس نمط سے ہر لیل ہر نہار
ہر رات اختروں کے تئیں دانہ بوجھ کر
دیکھے ہے آسماں کی طرف ہو کے بے قرار

تنکا اگر پڑا کہیں دیکھے ہے گھانس کا
چوکے کو آنکھ موندھ کے دیتا ہے وہ پسار
خط شعاع کو وہ سمجھ دستۂ گیاہ
ہر دم زمیں پہ آپ کو پٹکے ہے بار بار
پیدا ہوئی ہے تن پہ اگن باد اس قدر
ھد گز دروغ اس کو تو مت جان زینہار
گزرے وہ جس طرف سے کبھی اوس طرف نسیم
بادِ سموم ہووے وہیں گر کرے گذار
دیکھے ہے جب وہ توبڑہ تھان کی طرف
کھودے ہے اپنے سم سے کنوئیں ٹاپیں بار بار
فاقوں سے ہنہنانے کی طاقت نہیں رہی
گھوڑی کو دیکھتا ہے تو پادے ہے بار بار
ہے اس قدر ضعیف کہ اڑ جائے باد سے
میخیں گر اوس کے تھان میں ہووین نہ استوار

نے استخواں نہ گوشت نہ کچھ اوس کے پیٹ میں
دھونکے ہے دم کو اپنے کہ جوں کھال کو لوہار
سمجھا نہ جائے یہ کہ وہ ابلق ہے یا سرنگ
خارشت سے زبسکہ ہے مجروح بے شمار
یہ حال اس کا دیکھ غرض یوں کہے ہے خلق
جنگل سے موذی کے تو چھوڑا اس کو کہ دگار
ہر زخم پر زبسکہ بھنکتی ہیں مکھیاں
کھتے ہیں اس کے رنگ کو مگسی اس اعتبار
لے جاویں چور یا مرے یا ہو کہیں یہ گم
اس تین بات سے کوئی جلدی ہو آشکار
تنہا نہ اس کے غم سے ہے دل تنگ زین کا
خوگیر کا بھی سینہ جو دیکھا تو ہے فگار
القصہ ایک دن مجھے کچھ کام تھا ضرور
آیا یہ دل میں جائیے گھوڑے پہ ہو سوار

رہتے تھے مگر کے پاس قضا را وہ آشنا
مشہور تھا جنہوں کنے وہ اسپ نابکار
خدمت میں ان کی مَیں نے کیا جا یہ التماس
گھوڑا مجھے سواری کو اپنا دو مستعار
فرمایا جب انہوں نے کہ اے مہربانِ من
ایسے ہزار گھوڑے کروں تم پہ میں نثار
لیکن کسی کے چڑھنے کے لائق نہیں یہ اسپ
یہ واقعی ہے اس کو نہ جانو گے انکسار
صورت کا جس کے دیکھنا ہیگا گدھے کو ننگ
سیرت سے جس کے نت ہے سگ خشمگیں کو عار
بد رنگ جیسے لید و بدبو ہے جوں پشاب
بدیمن یہ کہ اصطبل اوجڑ کرے ہزار
مانند مینخ کے لگد زن ہے تھان پر
لاجنب وہ زمین سے ہے جوں میخ استوار

جھنڈی ہے اس قدر کہ بجنسہ اُس کی پشت پر
دجال اپنے منہ کو سیہ کر کے ہو سوار
اتنا وہ سرنگوں ہے کہ سب اوڑ گئے ہیں دانت
جبڑے پر لیس کہ ٹھوکروں کی نت پڑے ہے مار
ہے پیر اس قدر کہ جو بتلائے اس کا سن
پہلے وہ لے کے ریگ بیاباں کرے شمار
لیکن مجھے زروئے تواریخ یاد ہے
شیطاں اسی سے نکلا تھا جنت سے ہو سوار
کم رو ہے اس قدر کہ اگر اس کے نعل کا
لوہا گلا کے تیغ بناوے کبھو لوہار
ہے دل کو یہ یقین کہ وہ تیغ روز جنگ
رستم کے ہاتھ سے نہ چلے وقت کارزار
مانند اسپ خانۂ شطرنج اپنے پانوں
جز دست غیر کے نہیں چلتا ہے زینہار

اک دن گیا تھا مانگے یہ گھوڑا برات میں
دولھا جو بیاہنے کو چلا اوس پہ ہو سوار
سبزے سے خط سیاہ و سینہ سے ہو اسفید
تھا سرو سا جو قد سو ہوا شاخ بار دار
پہنچا غرض عروس کے گھر تک وہ نوجواں
شیخوخیت کے درجے سے کہ اُس طرف گذار
مُٹھا تو اس قدر ہے وہ جو کچھ کہ تم سنا
لیکن اب ایک دن کی حقیقت کہوں ہیں یار
دہلی تک آن پہنچا تھا جس دن کہ مرہٹہ
مجھ سے کہا نقیب نے آکر ہے وقتِ کار
مدّت سے کوڑیوں کو اُڑایا ہے گھر میں بیٹھ
ہو کر سوار رن کر وہیدان ہیں کارزار
ناچار ہو کے تب تو بندھایا میں اوس پہ زین
ہتھیار باندھ کر ہیں ہوا جاگے پھر سوار

جس شکل سے سوار تھا اس دن میں کیا کہوں
دشمن کو بھی خدا نہ کرے یوں ذلیل و خوار
چابک تھے دونوں ہاتھ میں پکڑے تھا منہ میں باگ
تک تک سے پاشنہ کے مرے پانوں تھے فگار
آگے سے توبڑا اوسے دکھلاوے تھا سئیس
پیچھے نقیب ہانکے تھا لاٹھی سے مار مار
ہرگز وہ اس طرح بھی نہ لاتا تھا رو براہ
ہلتا نہ تھا زمین سے مانند کوہسار
اس مضحکے کو دیکھ ہوئے جمع خاص و عام
اکثر مدبروں میں سے کہتے تھے یوں پکار
پہیئے اسے لگاؤ کہ تا ہووے یہ رواں
یا بادبان باندھو پون کے دو اختیار
میں کیا کہوں غرض کہ ہر اک اس کی شکل دیکھ
تیغ زبان سے کاٹ گئے کرتا تھا گل نثار

کہتا تھا کوئی ہے بُز کوہی نہیں یہ اسپ
کہتا تھا کوئی ہیگا ولایت کا یہ حمار
کہتا تھا کوئی مجھ سے ہوُا تجھ سے کیا گناہ
کتوال نے گدھے پہ تجھے کیوں کیا سوار؟
کہنے لگا پھر آکے اس اجماع میں کوئی شخص
مرکب نہ یہ گدھا نہ یہ راکب گناہگار
سمجھوں ہوں میں تو یہ کہ سپاہی کے بھیس میں
ڈاین چلی ہے سیر کو ہو چرخ پر سوار
اس مخمصہ میں تھا ہی کہ ناگاہ ایک روز
فتنے کو آسماں نے کیا مجھ سے پھر دوچار
دھوبی کمہار کے گدھے اس دن ہوئے تھے گم
اس ماجرے کو سُن کیا دونوں نے واں گذار
ہر اک نے اس کو اپنے گدھے کا خیال کر
پکڑے تھا دھوبی کان تو کھینچے تھا دم کمہار

دریائے کشمکش ہوا اس آن موجزن
تھا عنفزیب ڈوبیے خفّت سے ایک بار
بدبستپی اس کی دیکھ کے کہ خرس کا خیال
لڑکے بھی واں تھے جمع تماشے کو بے شمار
رکھتا تھا کوئی لا کے سپاری کو منہ کے بیچ
ہو اس کے تن سے کوئی اکھاڑے تھا بار بار
کہتا تھا کوئی مجھ سے کہ تو مجھ کو بھی چڑھا
دونگا ٹکا تجھے میں ہے تو جیند ا اینوار
کتّے بھی بھونکتے تھے کھڑے اُس کے گرد وپیش
ساتھ اس سمند خرس نما کے ہو چشم چار
اس وقت میں نے اپنی مصیبت پہ کہ نظر
کہنے لگا خدا سے بہ رو رو کے زار زار
جھگڑوں میں دھوبیوں سے کہ لڑکوں کو دوں جواب
کتوں سے یا لڑوں کہ مروں اپنا پیٹ مار

بارے دعا مری ہوئی اس وقت مستجاب
واں سے بہر نمط کیا جنگاہ تک گذار
دستِ دعا اُٹھا کے میں پھر وقتِ جنگ کے
کہنے لگا جنابِ الٰہی میں یُوں پُکار
پہلے ہی گولا چھوٹتے اس گھوڑے کے لگے
ایسا لگے یہ تیر کہ ہووے جگر کے پار
یہ کہہ کے مَیں خدا سے ہُوا مستعد بجنگ
اتنے میں مرہٹہ بھی ہُوا مجھ سے آ دوچار
گھوڑا تھا بسکہ لاغر و پست و ضعیف و خشک
کرتا تھا یوں خفیف مجھے وقتِ کارزار
جاتا تھا جب ڈپٹ کے میں اس کو حریف پر
دوڑوں تھا اپنے پانوں سے جوں طفل نے سوار
جب دیکھا میں کہ جنگ کی یاں اب بندھی ہے شکل
لے جوتیوں کو ہاتھ میں گھوڑا بغل میں مار

دھر دھمکا واں سے لڑتا ہوُا شہر کی طرف
القصّہ گھر میں آن کے مَیں نے کیا قصد

○

(۴)

شہر آشوب

کہا میں آج یہ سودا سے کیوں تو ڈانواں ڈول
پھرے ہے جا کہیں نوکر ہو لے کے گھوڑا مول
لگا وہ کہنے یہ اس کے جواب میں دو بول
جو میں کہوں گا تو سمجھے گا تو کہ ہے یہ ٹھٹھول
بتا کہ نوکری بکتی ہے ڈھیریوں یا تول

سپاہی رکھتے تھے نوکر امیر دولت مند
سو آمد اُن کی تو جاگیر سے ہوئی ہے بند
کیا ہے ملک کو مدت سے سرکشوں نے پسند
جو ایک شخص ہے بائیس صوبے کا خاوند
رہی نہ اس کے تصرف میں فوجداری کول

قوی ہیں ملک میں مفسد امیر ہیں سو ضعیف
ٹکے کہاں جو ہمیں دے کے ہوں انہوں سے حریف
نہ کچھ ربیع میں حاصل نہ درمیانِ خریف
جو عامل اب ہیں محالات پر سو یوں ہیں نحیف
کہ جس طرح کسی حاکم کے گھر گنوار کی اول

بس ان کا ملک میں کارنسق جو یوں ہو تباہ
کہ کوہ زر ہو زراعت میں تو نہ دیں پرِ کاہ
جگہ وہ کونسی نوکر رکھیں یہ جس پہ سپاہ
کہاں سے آویں پیادے کریں جو پیش نگاہ
کدھر سوار جو پیچھے چلیں وہ باندھ کے غول

رہی فقط عربی باجے پر انہوں کی شان
جو چاہیں اس کو نہ بجوا دیں یہ تو کیا امکان
پہ ان کا فکر ہے تخفیف خرچ پہ ہر آن
رہے گا حال اگر ملک کا یہی تو ندان
گلے میں تاشا کہاروں کے پالکی میں ڈھول

انہیں ہے اپنی امارت سے اب یہی منظور
کہ ہوں دو مور چھل اور ایک کا نبی کا ہمور
نہ رسم صلح کی سمجھیں نہ جنگ کا دستور
جو ان میں قاعدہ داں تھے ہوئے وہ اُن سے دور
قماش ان کی طبیعت کا سب طرح سے ٹھٹھول

امیر اب جو ہیں دانا انہوں کی ہے یہ چال
ہوئے ہیں خانہ نشیں دیکھ کہ زمانے کا حال
بچھی ہے سوزنی خوجا کھڑا جھلے ہے رومال
حضور بیٹھے ہیں اک دو ندیم اہل کمال
دھری ہے سامنے اک پیکدان و اک تنبول

جو کوئی ملنے کو ان کے انہوں کے گھر آیا
ملے یہ اس سے گر اپنا دماغ خوش پایا
جو ذکر سلطنت اس میں وہ درمیاں لایا
انہوں نے پھیر کے اودھر سے منہ یہ فرمایا
خدا کے واسطے بھائی کچھ اور باتیں بول

جو مصلحت کے لئے جمع ہوں صغیر و کبیر
تو ملک و مال کا فکر اس طرح کریں ہیں مشیر
وطن پہنچنے کی سوجھی ہے بخشی کو تدبیر
کھڑا یہ اٹکلے دیوان خاص بیچ وزیر
کہ شامیانہ کے بانسوں پہ نقرئی ہیں خول

خجل ہو یہ نہ سمائے زمیں بہت پھاڑی
کیئے وہ مشورے میں کھلبلیں خوں سوا ماڑی
تمام عمر ہے تدبیر ملک میں کاٹی
ندان کہ اٹھے مل کہ گھر اینٹ کا ماٹی
پھر اپنے زعم میں ہر اک برائے خود بہلول

پڑے جو کام انہیں تب نکل کے کھائی سے
رکھیں وہ فوج جو ہوتے بھری لڑائی سے
پیادے ہیں سو ڈرین سر منڈاتے نائی سے
سوار گر پڑیں سوتے میں چارپائی سے
کرے جو خواب میں گھوڑا کسی کے نیچے لول

نہ صرف خاص میں آمد نہ خالصہ جاری
سپاہی تا متصدی سبھوں کو بیکاری
اب آگے دفتر تن کی میں کیا کہوں خواری
سوال دستخطی پھاڑ کر کے پنساری
کسی کو آنولہ دے باندھ کر کسی کو کٹول
یہ جتنے نقدی و جاگیر کے تھے منصب دار
تلاش کر کے ڈھلیتی انھوں نے ہو ناچار
ندان قرض میں بنیوں کے دی سپر تلوار
گھروں سے اب جو نکلتے ہیں لے کے وہ ہتھیار
بغل کے بیچ تو سونٹا ہے ہاتھ میں کچکول
کروں معاش کا حضرت کی تجھ سے کیا میں بیاں
کہ توشہ خانہ ہے ان کا براپچی کی دُکاں
نکل تنور کے منہ سے کہے ہے گاؤزباں
بکی ہوں تب میں کہ جب کاتبی خلد مکاں
بکی ہے تیرے فاقہ میں کوڑیوں کے مول

کہے جو مودی سے جا کر دو اب کے حالات
جواب دے ہے کہ ہے اونٹ تو فرشتے کی ذات
ہوا یہ جیتی ہے بیلوں کی اور بھبس پہ برات
جو خچریں ہیں انہوں نے پیا ہے آب حیات
تمہارے کھانے کو دانا کہو تو دیجئے تول

جو اصطبل میں کئی گھوڑے ہیں سو کیا امکان
کہ ہو وے گھاس کے پٹھے کا ان کے آگے نشان
کسو کی ٹوٹی ہے ٹنگڑی کسو کا جھڑ گیا کان
طویلہ اس کو کہوں یا ہیں پنج پیر کا تھان
اسی خیال میں رہتی ہے عقل ڈانوا ڈول

اور اب جو زعم میں آفت کے فیل خانا ہے
جو ہتنی اندھی ہے اس میں تو ہاتھی کانا ہے
نہ ڈھور چارے کا دانتے کا نے ٹھکانا ہے
ہر ایک بھوک سے سوئے عدم روانا ہے
اب اس کو خواہ وہ پائل سمجھ لیں خواہ جھول

کرے ہے بھوک سے شاگرد پیشہ اب یہ معاش
کہیں پلاؤ تو باورچی واں پکاویں آش
کریں قناتوں میں دربان بیٹھے پردہ فاش
نمدے سے کھینچ لے مسند کو آن کرفتہ اش
اگر کہیں کہ مٹا اٹھ کے چاندنی کا جھول

یہ خادمانِ محل کی ہے ان دنوں صورت
نہ خوان ڈھونے کا کشمیرنی میں باقی ست
نہ اُٹھ کے ہلنے کی ھرگز ہرو نے کی طاقت
بنی ہے بھوکھ سے دربانوں کے یہ منہ کی گت
کہ بوڑھی ہتنی کے جس طرح بیٹھ جائے کپول

مچا رکھی ہے سلاطینوں نے یہ تو یہ دھاڑ
کوئی تو گھر سے نکل آئے ہیں گریباں پھاڑ
کوئی در اپنے پہ آ و سے دسے مارتا ہے کواڑ
کوئی کہے جو ہم ایسے ہیں چھپاے ہیگی پہاڑ
تو چاہئے کہ ہمیں سب کو زہر دیجئے گھول

غرض تا حال ہے اِس گفتگو سے یہ میرا
کہ بے زری نے جب ایسا گھر آن کو گھیرا
تو کوئی قصد کرے نوکری کا بہتیرا
نہیں یہ فائدہ کچھ تا وہ چھوڑ کر ڈیرا
کرے نہ عزم سوئے اصفہان و استنبول

جو نوکری ہے کہیں زیرِ چرخ نیلی فام
سو جائداد کا اس کے ہے پرگنہ سرسام
وبا کا جب سے ہے دارالخلافہ میں ہنگام
گھروں کی ضبطی کا رسم اس قدر ہوا ہے عام
ادھر کسی کا دکھا سر اُدھر سے دوڑی قول

سو کیا وہ نوکری گتی ہے جس میں یہ اوقات
ملے ہے پیٹ کو روٹی سو روز و آدھی رات
جو چاہیں تن ڈھپے اس میں سو آگے پیچھے ہات
اور اس پہ یہ کہ وہ تب ٹھہرے نذر موجودات
جو پانچوں باندھے ہتیار اور چھٹی پستول

وہ نوکر اب جسے آفت ہر آن پہچانے
جو پوچھو اس سے کہ تم کچھ روپے لگے پانے
کہے ہے آہ وہ بھر کر سوائے آٹھ آنے
روپے کی شکل نہیں دیکھی ہے خدا جانے
کہ اس زمانے میں چپٹا ہے وہ یا گول

غرض کہ جب تنہیں ملتا ہو یاں بھر بھی چون
کرے وہ نوکری جس کو کہ ہووے خبط وجنون
نہ جانو یہ کہ انہیں جب سپہ گری کا فنون
نہ آیا سیکھ تو یوں باندھنے لگے مضمون
زمانہ دیکھ کے ہتھیار ہم نے ڈالے کھول

سخن جو شہر کی ویرانی سے کروں آغاز
تو اس کو سن کے کریں ہوش چند کے پرواز
نہیں وہ گھر نہ ہو جس میں شغال کی آواز
کوئی جو شام کو مسجد میں جائے بہر نماز
تو واں چراغ نہیں ہے بجز چراغ غول

کسی کے یاں نہ رہا آسیا سے تا بہ اجاغ
ہزار گھر میں کہیں ایک گھر جلے ہے چراغ
سو کیا چراغ وہ گھر ہے گھروں کے غم سے داغ
اور ان مکانوں میں ہر سمت رینگتے ہیں الاغ
جہاں بہار میں سنتے تھے بیٹھ کر ہنڈول

خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ پاس
کہ جس کے دیکھے سے جاتی رہی تھی بھوک اور پیاس
اور اب جو دیکھو تو دل ہووے زندگی سے اداس
بجائے گل چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس
کہیں ستون پڑا ہے کہیں پڑے مرغول

یہ باغ کھا گئی کس کی نظر نہیں معلوم
نہ جانے کن نے رکھا یاں قدم وہ کون تھا شوم
جہاں تھے سرو و صنوبر وہاں اگے ہیں زقوم
مچے ہے زاغ و زغن سے اب اس چمن میں دھوم
گلوں کے ساتھ جہاں بلبلیں کریں تھی کلول

دکھیں تھے سیر کو پنگھٹ کے گرد کے دیہات
کہ لب جہاں کے تھے پنہاریوں کے آب حیات
اور ان درختوں کی وُے چھائیں وُے گھنے سے پات
نہ وُے درخت ہیں اب واں نہ آدمی کی ذات
کوئیں میں مُردے پڑے ہیں نہ ریسمان ہے نہ ڈول

جہاں آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا
مگر کبھو کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا
کہ یوں مٹا دیا گویا کہ نقش باطل تھا
عجب طرح کا یہ بحر جہاں میں ساحل تھا
کہ جس کی خاک سے لیتی تھی خلق موتی رول

دیا بھی واں نہیں روشن تھے جس جگہ فانوس
پڑے ہیں کھنڈروں میں آئینہ خانہ کے مانوس
کہ ورد دل پہ از امید ہو گئے مایوس
گھروں سے یوں نہ نکل گئی ناموس
ملی نہ ڈولی انہیں جو تھے صاحب چہ ڈول

نجیب زادیوں کا ان دنوں ہے یہ معمول
وہ برقع سر پہ ہے جس کا قدم تلک ہے طول
ہے ان کی گود میں لڑکا گلاب کا سا پھول
اور ان کے حسن طلب کا ہر ایک سے یہ جھول
کہ خاک پاک کی تسبیح ہے جو لیجے مول

اگر محب ہوا مستمع تو سن یہ نام
دیا کچھ اس نے بمقدور کر کے نذر امام
پڑا جو شامت طالع سے خارجی سے کام
دروغ و راست کا لایا وہ درمیاں میں کلام
یہ آگئے اور چلیں کہہ کے زیر لب لاحول

غرض میں کیا کہوں یارو کہ دیکھ کر یہ قہر
کہ ود مرتبہ خاطر میں گذرے ہے یہ لہر
جو ٹک بھی امن دل اپنے کو دیوے گردش دہر
تو بیٹھ کر کہیں یہ روئیے کہ مردم شہر
گھروں سے پانی کو باہر کریں جھکول جھکول

بس اب خموش ہو سودا کہ آگے تاب نہیں
وہ دل نہیں کہ اب اس غم سے جو کباب نہیں
کسی کی چشم نہ ہو گی کہ جو پُر آب نہیں
سوائے اس کے تری بات کا جواب نہیں
کہ یہ زمانہ ہے اک طرح کا زیادہ نہ بول

(۵)

غزلیات فارسی

من بدلِ جورِ ترا بهتر ز مهر انگاشتم
گرچه در ذیلِ ستم کیشاں تو مشہوری بیا

نرگس ترا ست قصۂ دل خوں شدن ز گل
لیکن بپاسِ خاطرِ دلبر نگفتہ ام
نامحرم است خضر بجائے کہ میروم
نامِ مقامِ دوست برہبر نگفتہ ام
از بہرِ دستگیریٔ خود درمیانِ آب
جاں دادہ ام ولے بشناور نگفتہ ام

سودا برائے جرعۂ آبے دریں دیار
ہرگز بخضر ہمچو سکندر نگفتہ ام
احوالِ تشنہ کامئ خود را بہ ہیچ کس
گاہے بغیر ساقئ کوثر نگفتہ ام

ہرگز مداں بہ وصلِ تو بے جا گریستم
امروز بر جدائی فردا گریستم
از پردہ تا بروں نفتد رازِ عشقِ دوست
رفتم بروں ز شہر و بصحرا گریستم

○

٦

(ا)

دوہے

۱

لے لے تیرا نام اب ، روتی ہوں دن رین
ایسا بیری کون تھا ، جن نے کھویا چین

۲

مجھ کو قاسم بیاہ کر ، کدھر گیا ہے روٹھ
لوگ کہیں مارا گیا ، مَیں جانوں ہوں جھوٹھ

۳

جگ میں ان کا کون ہے ، تجھ بن آج حسینؑ
کون تسلی دے ہمیں ، کیوں کر آوے چین

۴

عالم جس کو اے سودا ، کہے مدام امام
جگ میں تو بھی رو تبو ، لے لے اُس کا نام

(۷)

قصیدہ در مدح حضرتِ علی

در منقبت امیر المومنین اسد اللہ الغالب علی رضؑ ابن ابی طالب صلوٰۃ اللہ علیہ

اُٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستاں سے عمل
تیغ اردی نے کیا ملک خزاں مستاصل
سجدۂ شکر میں ہے شاخ ثمر دار ہر ایک
دیکھ کر باغ جہاں میں کرم عز و جل
قوت نامیہ لیتی ہے نباتات کا عرض
ڈال سے پات تلک پھول سے لے کر تا پھل
واسطے خلعت نوروز کے ہر باغ کے بیچ
اب جو قطع لگی کرنے روش پہ مخمل
بخششی ہے گل نو رستہ کی رنگ آمیزی
پوشش چھیپٹ قلمکار بہر دشت و جبل

عکس گلبن یہ زمیں پر ہے کہ جس کے آگے
کارِ نقاشیٔ مانی ہے دوم وہ اوّل
تارِ بارش میں پروتے ہیں گہر ہائے تگرگ
ہار پہنانے کو اشجار کے ہر سو بادل
بار سے آبِ رواں عکس ہجوم گل کے
لوٹے ہے سبزہ پہ ازبسکہ ہوا ہے بیکل
شاخ میں گل کی نزاکت یہ بہم پہنچی ہے
شمع ساں گرمیِ نظارہ سے جاتی ہے پگل
جوشِ روئیدگیِ خاک سے کچھ دُور نہیں
شاخ میں گاو زمیں کے ہی جو پھوٹے کونپل
دمِ عیسےٰ سے فزوں فیض ہوا ہے یاں تک
دہن میں قسمِ جمادات سے شاید ہو خلل
فکر رہتی ہے مجھے یہ کہ زباں سے اپنے
کہیں دعوئے خدائی نہ کریں لات و ہبل

حدِ ایام کی پیش از مددِ نامیہ سے
بچۂ مرغِ چمن تخم سے آتا ہے نکل
سبز ہوتا ہے تفیضی کے سبب سے ہر بار
جو زباں سے سخن اب طوطی کے آتا ہے نکل
دستِ گل خوردہ و شاخ گل و گلزار بہم
بجہاں نشو و نما کرنے میں ہیں ضرب مثل
غنچہ پر کچھ نہیں موقوف عجب فصل ہے یہ
گل بہم پہنچے ہے عقدہ ہو کسی طرح کا حل
آوے ہے ان کے نظر لاکھ طرح کا وہ پھول
اون گلوں چھیٹ جو نگہہ کے ہیں سدا مستعمل
یاسمن رنگ جو رکھتی ہے خزاں سے مانا
چاہتی ہے بسما جت کرے سبزے سے بدل
چشم نرگس کی بصارت کی زبس ہے درپے
غنچۂ لالہ نے سرمہ سے بھری ہے مکحل

اس قدر محو تماشا ہے کہ نرگس کی طرح
چشم بیدار گلستاں میں جھپکتی نہیں پل
آبجو گرد چمن لمعۂ خورشید سے ہے
خط گلزار کے صفحہ پہ طلائی جدول
سایۂ برگ ہے اس لطف سے ہر اک گل پر
ساغر لعل میں جوں کیجے زمرد کو حل
سنگ نے رتبۂ آئینہ کیا ہے پیدا
تیغ کہسار ہوئی بس کہ ہوا سے صیقل
برگ برگ چمن ایسی ہی صفا رکھتا ہے
گل کو دیکھو تو نگہ جاتی ہے سنبل پہ پھسل
ڈگمگاتی ہوئی پھرتی ہے خیاباں میں نسیم
پاؤں رکھتی ہے صبا صحن میں گلشن کے سنبھل
اتنی ہے کثرت لغزش بہ زمین ہمہ باغ
جو ثمر شاخ سے اترا سو گرا سر کے بل

فیضِ تاثیر ہوا یہ ہے کہ اب حنظل سے
شہد ٹپکے جو لگے نشترِ زنبورِ عسل

دانہ جس شورزمیں سے نہ پھلا دہقاں سے
سبز وہاں دانۂ شبنم سے ہوا ہے جنگل

کشت کرتے ہیں ہر اک تخم سے از فیضِ ہوا
گرتے گرتے بزمیں برگ و بر آتا ہے نکل

سبز فام ان دنوں آتا ہے نظر ہر کلمہ
خواہ ہو شیخ پسر خواہ ہو فرزندِ مغل

جو ہدی کو چمنستانِ جہاں میں اس فصل
آ گیا لعل و زمرد کے پرکھنے میں خلل

تاکجا شرح کروں میں کہ بقولِ عرفی
اخگر از فیضِ ہوا سبز شود در منقل

نسبت اس فصل کو پر کیا ہے سخن سے میرے
ہے فضا اس کے تو دو چار ہی دن ہیں فیصل

اور میرا سخن آفاق میں تا یوم قیام
رہے گا سبز بہر مجمع و ہر یک محفل
تا ابد طرزِ سخن کی ہے مرے رنگینی
جلوۂ رنگ چمن جاویگا اک آن میں ڈھل
نام تلخی نہیں مجھ نطق میں جز شیرینی
یک طرف نادِ گلستاں میں ہے یکسو حنظل
ہیں بہ ومند سخنور مرے ہر مصرع سے
مصرع سرو سے پایا ہے کسی نے بھی پھل
ہو جہاں کے شعراء کا مرے آگے سرسبز
نہ قصیدہ نہ مخمس نہ رباعی نہ غزل
ہے مجھے فیضِ سخن اس کی ہی مداحی کا
ذات پر جس کے ہیں مُہرِ کُنہِ عزّ و جل
مہر سے جس کے منور رہے دل جوں خورشید
رو سیہ کینے سے جس کے رہے مانند زحل

بغض جس کا کرے جوں مور و سلیماں کو ضعیف
مور کو حب سے ملے جس کے بلوں کا سا بل
ہمائے وصلت بہ نبی جس کو نہ دے غیر از عرش
فرش گلزار زمیں حق نے سمجھ مستعمل
شیر یزداں شہ مرداں علی عالی قدر
وصی ختم رُسل اور امام اوّل
خاک نعلین کی جس کی مدد طالع سے
پہنچے اس شخص کو جو شخص ہوا عمائے ازل
وہ نظر آئے اسے دہر کی بینائی سے
رہ گیا اور رہے گا جو ابد تک اوجبل
مدح غائب سے کھلے او سکے نہ مداح کا دِل
روبرو مطلع ثانی سے یہ ہو عقدہ حل
دیدہ تیرا بدوئی حق سے نگہہ کا ہے خلل
ایک شے دو نظر آتی ہے بچشمِ احول

تیری قدرت بجہاں قدرت حق کے خاطر
خلق کے وہم غلط کار ہیں ٹھہرے ہے مثل
مرضی حق تری مرضی سے ہے جوں جوہر فرد
اس یقیں میں نہ گماں کر سکے زنہار خلل
علم تیرا نہیں کچھ علم خدا سے باہر
ہے عمل بھی وہی تیرا جو خدا کا ہے عمل
رائے تیری کے موافق جو نہ لکھے نسخہ
کرے تاثیر نہ عیسےٰ کا مداوا بہ کسل
تیر کے پیکان نہ قبضے سے کمان کے سرمو
ہو اشارا جو ترا تیر قضا کو کہ نچل
ٹک تری مرضی سے باہر جو کرے کام جہاں
ہاتھ سے کام زمانے کے دو ہیں جالے بچل
معنیٔ علت غائی جو نہ ہو تو اون کا
خانۂ ہر دو جہاں پھر ہوں دو بیت مہمل

سایہ ہیں دستِ کرم کے ترے ہر صبح و مسا
دولتِ ہر دو جہاں سے ہو غنی عبد اقل
دین و دنیا کی ہے اشیا سے کہیں وہ اعلیٰ
ہو وے جو شے ترے اشیا میں سبھوں سے اسفل
جو گدا ہے بجہاں تیرے گدائے در کا
اس کی درگاہ و گدا کہیئے جسے اہلِ دُول
ایسی بخشش نہ ہوئی تجھ سے کہ جس کی بشمار
حدِ تعداد ہے جتنی نہ ہوئی ہو فیصل
وصف تجھ تیغ دو سر کا میں کروں کیا شہ دیں
دلِ مجنوں کی جو میدان میں کرے ہے صیقل
اس کے قبضہ پہ جو ہو دستِ مبارک تیرا
نہ ہیں دینِ محمد کے سوا اور ملل
کھینچ اُسے گر تو عدو پر کرے میداں میں نہیب
استقامت کا زمانے کے قدم جائے نکل

عرض میں سے دو طرف ہو کے لگے بہنے طول
بڑے دریا میں جو وہ نقد قد انداز او گل
جمع کب رہ سکیں اعدا کے حواسِ خمسہ
دیکھ کر اس کو علم ہاتھ میں تیرے یک پل
توامِ اجزا جو موالید کے ہیں یک دیگر
منجمد رہتے ہیں ان کے وہیں آجائے خلل
نرم اور سخت مساوی ہے کسو پر آوے
خواہ بر روئے قز و خواہ وہ بر پشتِ جبل
اس کو آسیب نہیں صولتِ شمشیر قضا
نہ چھڑے وہ نہ ہرے وہ نہ پڑے آنہیں بل
زیرِ راں ہے جو ترے رخشِ فلک سیرِ شہا
ہے وہ محبوب جسے کہیئے نہایت اچپل
شکل کیا اس کی بتاؤں کہ جیسے شوخی سے
دائرہ بیچ تصوّر کے نہیں پڑتی کل

اس کی سر چوٹی کا میں حسن کہوں کیا جس کے
زلف معشوق کا دیکھے سے نکل جاوے بل
بزعم وگام سے باہر ہے کچھ اس کی رفتار
ہے چھلاوے کی طرح چال میں اسکے چھل بل
بلکہ وہ ہاتھ سے شاطر کے اگر ہو جاوے
پڑ سکے پیچھے نہ اس کے کوئی جز اس کے کفل
جست و خیز اس کی بیاں کیجئے گر پیش حکیم
اعتقاداتِ حکیمانہ میں آجائے خلل
قاش سے زین کے ذرہ جو اچک جائے عناں
مارے جوں روئے زمیں پشتِ فلک کو وہ کھنڈل
میخ سے نعل کے اس کے میں اگر دوں تشبیہ
کرے دوری کو تمام اپنے بیک آن زحل
اس کی جلدی کا تو کیا ذکر ہے سبحان اللہ
نسبت اس کی فرس ایسا کہ جیسے کہئے اچل

توسنِ وہم کو دوڑائے جو ساتھ اس کے تو ہو
بازگشت اس کا تمام اس کے بگام اوّل

خانۂ زین کب اس کا ہے کم از بیت اللہ
تجھ سے معنی کی نشست اس میں ہو جب روزِ ازل

ہیبتِ عدل یہ تیری ہے کہ ہر دشت میں شیر
واسطے دردِ سر آہو کے گھسے ہے صندل

سامنے بز کے یہ کیا دخل کہ نکلے آواز
گرگ کے پوست کو منڈھوا کے بجائیں جو دہل

موردِ سنگ ہو شیشہ تو غضب سے کر دے
کوہ کو ہر دو کفِ دست میں مل کر خردل

ذکر و اذکار ترے حفظ کا گر آ جاوے
کسی محفل میں بتقریب زباں پر یک پل

شعلۂ شمع کی گرمی سے یقیں ہے دِل پر
شب سے تا صبحِ قیامت نہ سکے موم پگل

معدلت کیش تری ذات ہے ایسی شاہا
آنچ سے آگ کے ٹک خسمیں جو آجاوے بل
کرہ نار تجھ آتش سے غضب کے جل کر
چشم لوبی فلک کے لئے ہووے کاجل
مرغ زرین فلک عہد میں تیرے شاید
بوجھ کر دانہ گیا ہے کسی اختر کو نگل
تار تار اس کے جو یہ بال و پر آتے ہیں نظر
بازِ قدرت نے ترے پنجہ سے ڈالا ہے مسل
امر سے نہی کے تیرے بجہاں یا شہِ دیں
کام پہنچا ہے مناہی کا بھی یاں تک بذلل
کہ حیا سے بچمن غنچہ سر اپنا کیا دخل
نسبتِ شکل صراحی سے اٹھاوے یک پل
جب سے گل بولتے بلبل نے قماری کو سنا
عشق گل تب سے دھویا کہتی ہے دل سے ململ

جوش میں آوے یہ کیا معنی بجُز لائے شراب
چشمہ سے ہیں یہ ڈروں ہوں نہ سکے آب ابل
رقص بے دخل کچھ اب روئے زمیں پر ہی نہیں
پیچھے لونی فلک کے بھی نہ باجے منڈل
کیونکہ آواز مغنی ہو گلے سے باہر
شرم سے ساز کے پردوں میں سدا ہے اوجھل
امر حق سے جو ملائک نے یہ چاہا سو نہیں
علم کا بار ترے کوہ و فلک کو یہ ازل
عرض دونوں نے کیا یوں بجنابِ اقدس
بوجھ اس میں ہے بہت ہم ہیں گرفتارِ کسل
آخرش تجھ کو ہی پایا متحمل اس کا
جب یہ دیکھا کہ کسی سے نہیں سکتا ہے سنبھل
دشتِ ارزن میں جو سلطاں کو ملے تجھ سے نجات
کچھ ترے وصف سے نسبت نہیں رکھتا یہ عمل

گر اسے کر کے بیاں سمجھوں ثنا کی میں نے
خلق سمجھے گی دماغ اس کا ہوا ہے مختل
جبہہ سا جو کوئی در کا اسد اللہ کی ہے
کلۂ شیر کو روبہ کے نہ سمجھے بشکل
محرمِ کنہ جو تیرا ہو کرے تیری مدح
سو تو جز علم خدا علم ہے سب کا مہمل
وصف تیرے کی ہے شایاں زباں تیری ہی
سمجھے تو آپ کو یا تجھ کو خداوندِ اجل
مدح اپنی نہ سمجھ یہ جو کہا میں اس سے
رتبہ تجھ مدح کا اعلےٰ ہے سخن ہے اسفل
عرضِ احوال ہے اپنا ہی مجھے اس سے غرض
تا بہ آخر جو یہ موزوں میں کیا از اول
سو تو وہ کیا ہے رہا ہو وے جو تجھ سے مخفی
سادہ لوحی یہ مرے کیجئے یہ نظم حمل

سب کا احوال ترے پیشِ ضمیرِ روشن
ایک سے دونوں ہیں کیا ماضی و کیا مستقبل
پر کروں کیا میں کہ ہے آٹھ پہر دل میرا
گردشِ چرخ سے جوں شیشۂ ساعت بیکل
نہ تو روزانہ مجھے اس سے خورش کا آرام
نہ مری چشم میں خواب اس سے شبانہ یک پل
کہی جاتی نہیں وہ مجھ سے جو اس ظالم نے
جس طرح کے مری اوقات میں ڈالے ہیں خلل
لابٹھایا مجھے گھر بار چھڑا لشکر میں
پالی بے چوب تلے اپنے بغیر از پرتل
اس ستمگار سے جب زور مرا کچھ نہ چلا
تب میں ناچار کہی شکوہ میں اس کے یہ غزل

غزل

داد کو کس کے فلک پہنچے کہ از روز ازل
صبح جو نکلے ہے خورشید سو لے کر مشعل
سامنے اُس کے اُٹھے دستِ تظلم اس کا
جوہرِ عقل میں جس شخص کے آ جائے خلل
خود یہ ظالم ہے تظلم یہ کرے کس کے نظر
آسیا کب کرے فضہ یاد یہ دانہ کو بہل
راست کیشوں سے کجی اتنی ہے اس ملعوں کو
کہ دیا سرو کو ان نے نہ کبھی پھول نہ پھل
سات یہ فتنے ہیں کہتے ہیں جسے ہفت فلک
ایک سے ایک بڑا ایک کے اک زیرِ بغل
میں جو دیکھا نہ کہ از نخل حیات انساں
بر لے آوے عمل اس کا کبھو امید و امل

ہے کہیں مہر کہیں کیں جو اُسے عالم سے
علم اس کا۔ ہے عجب عقدۂ ما لاینحل
اس ستم گر کے تلون سے بعالم ہے گنہ
شادی و غم میں نہ دیکھا میں تفاوت اک پل
سینہ کوٹے ہے نکلتی ہے وہ دروازے پر
گر کسی گھر میں کوئی جا کے بجاتا ہے وہل
حلقہ مارے یہ وہ افعی ہے محیط عالم
زہر کا جس کے نہیں ہے کوئی پا زہر بدل
فی الحقیقت ہیں یہ سب آبلے اختر نہ سمجھ
اس کے اندام پہ ماہتاب سے لے تا بہ زحل
زہر اپنے کو جو ہلیت سے تری یا حیدر
آپ پڑتا ہے گیا ہے بدن اس کا سب ہل

کر کے دریافت اس احوال کو اب یا مولیٰ
تجھ سے یوں عرض کرے ہے یہ ترا عبد اقل

یہ نہ کہہ مجھ پہ گوارا کہ گزند اس کے سے
ہند کی خاک میں اجزائے بدن جاویں گل
جلد پہونچا یہ زمینِ نجف اس عاصی کو
کہ اسے عمر ابد ہے وہ جو واں آئے اجل
یاں معاش اپنی نہ سمجھوں ہوں نہ میں اپنی معاد
اخذ و جر میں ہوں بد و نیک سے با مکر و دغل
تجھ سے جز راستی کیا عرض کیا جاتا ہے
علم میرا ہے یہ علم اور عمل ہے یہ عمل
مجھ کو کچھ عذر نہیں اس میں ترا ہوں میں غلام
خواہ تعزیر کر اب اس پہ مجھے خواہ بہل
مدعا اتنی عرائض کا مرے ہے یہ غرض
سرفرو ہو نہ مرا یاں بدرِ اہلِ دول
میری قسمت کے موافق تو معین کر دے
اپنی سرکار سے واں ما یتحمل کا بدل

ہاتھ پھیلائیے جا زیرِ فلک کس کے حضور
دستِ ہمت نظر آتا ہے جہاں کا بہ بغل
لیکن اس امر میں ہے حق بطرف خلقت کے
کہ کے جب دیدۂ قسمت سے سبھوں کے وجل
جو ہر جود و کرم تھا جو بروزِ تقسیم
لکھ گیا ہووے ترے نام سے منشیِ ازل
طاقتِ طولِ سخن آگے بھی ٹک سودا کو
بخش اے قوتِ بازوے نبیِؐ مرسل
چاہتا ہے کرے آخر وہ دعائیہ پر
نظم تجھ مدح کی بہتر ز کلامِ اوّل
برگ پیدا کرے تا باغ میں ہر ایک نہال
پھوٹے تا نامیہ سے شاخِ شجر میں کونپل
تا ملے خلقتِ نوروز بہ بستانِ جہاں
پاوے تا نیرِّ اعظم شرف از برجِ حمل

خوشہ روئیدگیِ خاک سے تا پہنچے بہم
دانہ کو جب تئیں کھینچا کرے خرمن سے نمل
تا کرے سبزہ بہ رخسارِ گل اندام نمود
تا پڑے سنبلِ پیچیدۂ محبوب میں بل
تا رہے داغ دلِ سوختۂ عاشق کو
پھولنا لالۂ خود رو رہے جب تک بجبل
بحر میں قطرۂ نیساں سے ہو جب تک گوہر
کڑکے تا وقت ترشح کے ہوا میں بادل
لبِ معشوق کو تا شہرہ دیں شاعر بہ شفق
چشمِ نرگس کے تئیں تا کریں نسبت بہ کسل
بوئے گل مست کرے باغ میں تا بلبل کو
تا کرے بادِ سحر عقدے کو غنچہ کے حل
موج ہو آب کے تا سرو کے پائیں زنجیرہ
جب تلک طوق رہے گردنِ قمری کا محل

تا لبِ جو پہ کرے غنچے کو استادہ حباب
تا بچھاوے بروش سبزۂ فرشِ مخمل
شاخ کے ہاتھ میں تا ہو بہ چمن ساغرِ گل
گل کے جب تک رہے غنچے کے صراحی بہ بغل
تا بہ میخانہ پئیں بادۂ گل گوں مے خوار
ساتھ مطرب کے بجے تا دف و نے چنگ و دہل
پھرے تا باغ میں ہر ایک روش پہ سرخوش
راہ چلتے میں قدم مست کا تا جائے پھسل
مہ کے پرتو سے ہو تا چاکِ گریبانِ کتاں
گل خورشید سے تا عشق رکھے دانۂ ظل
قدر ہو عود کی تا مجمر و آتش سے فزوں
لطف بو تا رہے عالم میں بچوبِ صندل
تا مسلّم رہے یہ نظم بیابِ الجنت
جب تلک اس سے برآوے مری امید و امل

نخلِ امید سے اپنے ہوں بر ومند محب ہو محبت نہ تری جن کو نہ پاویں وہ پھل

○

قصیدہ در مدح
عماد الملک غازی الدین خان

صبح ہونے جو گئی آج مری آنکھ جھپک
دی دوہیں آکے خوشی نے درِ دل پر دستک
پوچھا میں کون ہے، بولی کہ وہ میں ہوں غافل
نہ لگے شوق میں جس کے کبھو مشتاق کی پلک
ہے "خوشی" نام مرا، ہوں میں عزیزِ دلہا
زندگانی کی حلاوت ہے جہاں میں مجھ تک
کھول آغوشِ دل، اور لے مجھے جلدی ناداں
پھر خدا جانے یہ دن کب تجھے دکھلائے فلک

سُن کے یہ مژدۂ جاں بخش، جو میں کھولی آنکھ
اشعۂ نور کی سی، مجھ کو نظر آئی جھلک
آنکھیں مل کر کے جو دیکھوں ہوں، تو اک بادلہ پوش
سر سے لے غرق جواہر میں وہ ہے پاؤں تلک
حُسن ایسا کہ جیسے ماہِ شبِ چار دہم
یک بیک دیکھے تو یک چند ہی رہ جائے ٹھٹھک
چہرے میں ایسی ہے گرمی کہ شب و روز جیسے
باڈ کرتی ہی رہے دامنِ مژگاں کی جھپک
زلفیں یوں چہرے پہ بکھری ہوئی مانگیں تھی دل
جس طرح ایک کھلونے پہ ہمکیں دو بالک
جسد وہ قہر، کہ گھٹنے میں ہو جس کے ہر لہر
گھر ڈوبا دینے کو عشاق کے دریائے اٹک
ناگنی پیچ میں آ، اون کے نہ مانگے پانی
کھیل جائے وہ میں کالا جو ڈسے اُس کی لٹک

جبیں ایسی کہ جگر ماہ کا ہو جاوے داغ
اُس کی تشبیہہ سے جب اس کو نجاوے فلک
قتل کرنے کا یہ جوہر نہ ہو شمشیر کے بیچ
اُس کے ابرو سے مشابہ نہ بناویں جب تک
ڈھیٹ وہ تیز کہ عالم میں نہیں جس کی پناہ
چشم وہ ترک کہ ہو قوم جنھوں کا اُزبک
فتنہ اُس چشم کا ایسا کہ مژہ سے خونخوار
متصل چونکتے پا کر، دیا کرتے ہیں تھپک
حُسن سے کان کے آویزے میں یہ لطف کہ جوں
مُنعقد قطرۂ شبنم کہ پڑے گُل سے ٹپک
بحرِ خوبی کی گویا مچھلی ہے قلاب کے بیچ
نتھ کے حلقے میں جو دیکھے کوئی نتھنے کی پھڑک
نظر آیا نہ دہن بینی کو تنگی کے سبب
منخریں اپنی سے، گو اُن نے تراشی عینک

مسی آلودہ لب اغگوں تھے، تہِ خاکستر
کہ ہوا سے وہ سخن کہنے کو جاتے تھے دہک
سلکِ گوہر کی صفا، دم لے اُن دانتوں سے
برق دریوزہ کرے، موجِ تبسم کی چمک
دونوں عارض گویا شیشے ہیں مئے گلگوں کے
زنخ اور دونوں ہیں یوں، جیسے نمکداں میں گزک
وصف میں اُس کی ملاحت کے پڑھوں اک مطلع
جس کے آگے نہ رکھے، مطلعِ خورشید نمک

مطلع

رنگِ رخسار سے شرمندہ ہو کندن کی دمک
آگے غبغب کے، خجالت زدہ، سونے کی ڈلک
ڈھیلے پیچ اُس کے نے گردن کا بڑھایا یہ حُسن
جلوہ گر شمع ہو جیسے تہ دامانِ شبنک

ساعد و دستِ حنا بستہ کی ایسی حرکات

شاخ میں گل کے پون چھنے سے جوں آجائے لچک

دیکھے جو اُس کے لچھوں کو یہ تیقّن ہو اوسے

تلنو یہ تان کے یاں کام کا اوترا ہے کتک

یا وہ معجول مبہی کی ہیں ڈبیاں ایسی

آوے ہیجان میں چھیڑے سے جنھیں روحِ ملک

پیاری پیاری وہ لگائیں نظر دوں میں ایسی کہ نگاہ

یہی چاہے کہ کبھو پاس سے اُس کے نہ سرک

پنج یہ قصد رکھے ڈال دے تو ہاتھ ان پر

لنگ کے دل میں بھی آجائے کہ لے بھاگ اچک

نافِ کے حسن کو اُس کے جو کیا میں نے قیاس

دل نشیں یوں ہوا میرے کہ بلا شبہ و شک

نرگسی چشم کوئی ہوگا کہ جس کی یہ آنکھ

تاک کے چھاتی سے صفا کے سبب آئی ہے ڈھلک

کمر اُس کی میں نہ دیکھی کہ کروں اُس کا وصف
تھی وہ اک آہوئے دل کے لئے چیتے کی لپک
آگے تو کہہ نہیں سکتا میں کچھ اُس کی تعریف
یوں حیا کہتی ہے مجھ سے کہ بس اب زیادہ نہ بک
پس میں زانو کو کہوں کیا، کہ وہ ہیں آئینہ
اُس سے بھی چھوٹے نہ آنکھ، ان سے اگر جائے اٹک
آوے جس بزم میں، اُس ساقِ بلوریں کا ذکر
جلوۂ شمع کا پامالِ حسد ہووے نمک
پشتِ پا چھینے روئے لیلے سے مجنوں کا دِل
خونِ فرہاد سدا شیریں سے چاہے وہ کفک
وقتِ نظارہ مری جب نگہِ دیدۂ غور
سر سے لے اُس قدِ رعنا کے گئی پانوں تلک
فندقِ پا لگی کہنے، کہ نہ دیکھا ہوگا
سرو کی بیخ سے پھوٹا گُلِ اورنگ اب تک

قامت ایسا ہے کہ ہنگامِ خرام اُس کے اگر
آگے آ جائے قیامت تو یہ بولے کہ سرک
قدم اس ڈھنگ سے رکھے ہے کہ ہر عالم کا
موجبِ شور ہو خلخال کی پانوں کی جھنک
کج ادا کج چلے جس طرح وہ اٹکھیلی سے
موجِ دریا بھی اُسے دیکھے تو رہ جائے ٹھٹک
زرق برق ایسی ہے پوشاک میں اُس کے کہ جسے
کوند بجلی کی کہوں، یا کہوں شعلے کی چمک
جیسی سج سے تھی گلے بیچ حمائل گل کی
ویسی ہی عطر کی بُو، ویسی ہی سوندھی کی مہک
کیفی یاں تک کہ یہ انداز سخن میں اُس کے
کسی کو ہشت کہہ اُٹھنا، کسی کو دوت دبک
بات اس لطف سے بہکے تھی دہن سے اُس کے
بادہ جوں ساغرِ لبریز سے جاتا ہے چھلک

غرض اُس شکل سے آئی جو نظر وہ کافر
کہا میں دل کی طرف دیکھ کے اللہ معک
ناگہ اُس شوخ نے مجھ سے یہ کہا اے سودا
اب تو شیشۂ مۓ اندوہ کا پتھر سے ٹپک

یہ بھی کوئی طرز ہے رہنے کا زمیں پر نادں
یہ کوئی طور ہے جینے کا ترے زیرِ فلک
نہ ترے گھر میں، کبھو ناچ میں ہوتے دیکھا
نہ ترے در پہ سنی آ کے پکھاوج کی گمک
آدمی کے تئیں کچھ گرمیِ صحبت ہے شرط
وہ بھی انسان ہے دنیا میں جو اتنا ہو تنگ
گو ترا وضع زمانہ سے ہے دل افسردہ
پر ہم آئے ہیں ترے گھر میں ادھر دیکھ تنک

ایسے مہماں کی تو لازم ہے کہ خاطر ہو عزیز
بادہ بھر شیشے میں، رکھ لا کے نمکداں میں گزک
بزم آراستہ بلوا کے کر ارباب نشاط
پاس لے بیٹھ ہمیں سب کو چھکا، آپ بھی چھک
آج وہ دن ہے کہ جس گھر میں تو دیکھے اوس میں
کہیں ہوتی ہے بھگت، اور کہیں ہے اولک
یاں تلک شیخ و برہمن ہیں طرب کے مصروف
دیر میں بجتی ہے مردنگ، حرم میں ڈھولک
تار، تنبور نہیں، رشتۂ زنار فقط
لگے ہر سانج ہیں تسبیح کے بھی دانوں تک
بادہ کو ہاتھ سے زاہد کے نہ پیوے ملّا
پر یہ راضی ہے کہ کپڑوں پہ جو چھپکے تو چھڑک
محتسب سے چلے ہے مست رگڑ کر کاندھا
مغبچہ آیا چلا قاضی کے آگے ندھڑک

سُن کے مَیں نے یہ کہا اُس سے کہ اے مایۂ ناز
خیر ہے بات سمجھ کر تو کہہ اتنا نہ بہک
بے سبب کیونکہ میں اندوہ کی الفت چھوڑ بیٹھوں
کس طرح دوستیٔ غم کروں دل سے منفک
وجہ کچھ ہووے تو کہہ مجھ سے تو اُس کا اظہار
کچھ جہت ہو تو بیاں کر کہ سنوں میں بھی ٹک
کر کے دریافت یہ مجھ سے کہا اُس نے کہ مگر
سمع میں تیرے یہ مژدہ نہیں پہنچا اب تک
آج اُس شخص کی ہے سال گرہ کی شادی
کہ بصورت ہے وہ انسان و بسیرت ہے ملک
یعنی نواب سلیمان قدر و نام آصف جاہ
عہد میں جس کے یہ غیور بزرگ و کوچک
کسی کے آگے کوئی ہاتھ پسارے کیا دخل
مٹھی باندھے ہوئے پاتا ہے تولد کودک

عدل یہ عصر میں اُس کے ہے کہ ہر ایک طبیب
شعلۂ تپ کو بھی تبرید لکھے خار خسک

کرنے دیوے نہ رفو چاک کتاں کو انصاف
تا نہ رشتہ کے لئے ماہ کی کھوئے بیچک

رائج اتنی ہے مروّت کہ غزالوں کو پلنگ
اس طرح سمجھے ہے فرزند کو پالے پالک

دَور میں اُس کے ہے یاں تک تو مہیاتِ ذلیل
کشمکش سے یہ نت اُٹھ بنگ سدا از بہر کنک

ہمّت اُس کی پہ نظر کیجے تو اک آن کے بیچ
دل سے پہنچے ہے دو صد بادیہ مطلع لب تک

مطلع

تجھ سے ممنوں نہ فقط روئے زمیں پہ ہر یک
بارِ احسان سے تیرے ہے دوتا پشتِ فلک

ہو گُہر بار تجھ آگے ، جو سحابِ نیساں
برق ہو کر متبسم اُسے مارے چشمک
آگے تجھ بحرِ کرم کے صدفِ پُر گوہر
مٹھی اُس کی ہے جسے نکلے بشدت چیچک
چل سکے ہے نہ کسی امر میں تدبیرِ حکیم
پھر سے داتے کے تیرے وہ نہ لے تا دنتک
حلم تیرے کے جو ہم وزن فلک سے کچھ شے
ڈال دیوے زرۂ سہو و خطا کوئی ملک
بارِ تجھ حلم میں ہے یہ کہ تیرے وقتِ خرام
ہووے ذرہ بھی اگر مرکزِ خاکی کو دھمک
صدمہ ایسا کمرِ گاوِ زمیں کو پہنچے
شاخیں ہر چند وہ کھچواتے تو نکلے نہ کسک
دستِ دوراں سے موالید کا سر رشتۂ کار
نعرۂ قہر کی ہیبت سے ترے جائے ٹھٹک

پیلِ دنیا نہیں کچھ پیل کا پشہ کو کام
حولِ قوت سے ترے چاہیئے ٹک اوس کو کمک
تجھ کو للکار کے میداں میں صفِ مرداں کے
سامنے آئے ترے کون ہے ایسا مردک
وہ جواں تو ہے کہ آگے سے ترے رستم بھی
گاؤ سر مار بغل جائے دبے پانوں کھسک
اور ٹھہرے بھی کوئی آن تو حق نے دی ہے
دست و بازو میں ترے قوت و قدرت یاں تک
اس کے مرکب سے ملا کر دو ہیں مرکب اپنا
ہاتھ پٹکے میں دے اور زین کے خانہ سے اُچک
مارے جب زور سے دے چرخ زمیں پر تو اُسے
کمرِ دائرہ خاک میں آوے یہ لچک
کوہ ہر ایک اچھل کر جو زمیں پر بیٹھے
توڑ کر روئے سما چور کرے پشتِ سمک

کیوں نہ کوہِ لمن الملک تو مارے ہر دم
جب تری تیغ میں ہو جوہرِ بُرّش یاں تک
کھینچ کر اپنی کمر سے جو تو مارے اک ہاتھ
شکل نقارہ کی جوڑی کے دو حصّہ ہو فلک
نہ چلے خامہ اب آگے نہ سیاہی ہو رواں
بادپا کا ترے کچھ وصف نہ کیجے جب تک
چڑھ کے اُس پر جو تری طبع میں گذرے یہ خیال
قاش سے زین کے ٹک کھینچے اگر باگ اوچک
گاہ آجائے نظر، گاہ نظر سے غائب
پھر ہوا بیچ وُہ شب رنگ ہے جگنوں کی دمک
روبرو سے اگر آئینہ کے اس گلگوں کو
پھینک دے چڑھ کے جو تو شرق سے لے غرب تلک
اتنے عرصے میں پھر آوے کہ اسے باود کر
عکس بھی آئینے سے ہونے نہ پاوے منفک

شوکت و شان کہوں کیا میں ترے ہاتھی کی
چرخ پہ جوں مہِ نو ماتھے پہ یوں اس کے کُجک
وصف میں اُس کی بزرگی کے پڑھوں اک مطلع
گوشِ دل سے جو سخن رس متوجہ ہو تنک

اُس کے گجگاہ کی اللہ رے چہرے پہ لٹک
کہکشاں جوں شبِ یلدا میں نمایاں بہ فلک
بیٹھنے میں ہے وہ کوہ، اُٹھنے میں ہے ابرِ سیاہ
عرش رفعت ہیں وہ اور چلنے میں جوں چرخ اتھک
شجرِ طور کا چہرہ پہ ہو اُس کے جلوہ
رنگیں تزئیں کے لئے جس گھڑی اُس کی مستک
جھول پہ اُس کے ستاروں کا کہوں کیا میں حُسن
تارے جس طرح رہیں رات اندھیری میں چھٹک
لے کے خرطوم میں زنجیر پھر آوے وہ اگر
اُس کے دانتوں کو یہ سمجھے جو کوئی ہو زیرک

لیلیٰ اُنے ھاتھ نکالے ہیں سیہ خیمہ سے
ملنے کو مجنوں سے سُن سلسلۂ پا کی جھنک
روزِ میدان اُسے دیکھو تو دلاور اتنا
ہر کے واں سے، نہ جہاں سے کہ زمیں جائے سرک
سامنے اُس کے وہ چھوٹے ہے پٹاخوں کی لڑی
داغیں اک مرتبہ سو توپ، جو ہم سنگِ اٹک
چرخی کیا چیز ہے لاوے وہ جسے خاطر میں
بان بجلی کی کڑک کا کبھو پہنچے اُس تک
چاہے وہ توڑ کے جوں نیشکر اوس کی چھڑ کو
پانوں کھجلانے لگے سونڈھ میں لے کر پولک
بے تکان اس قدر اوس کا ہے چلاوا جیسے
مہر میں ابر کے آنے سے ہو سایہ کی ڈھلک
اس قدر ہے وہ سبک رو کہ کبھو چلتے وقت
پانوؤں کی اُس کے دلِ مور کو پہنچے نہ دھمک

اُس کے ہودج پہ تجھے دیکھ کے، سمجھے بہ خلق
کرسی پر عرش کے ہے صورتِ انساں کا ملک
خیمۂ جاہ کا تیرے سو کہوں کیا مذکور
ہووے استاد جہاں تیرے جلو کی اسپک
آسماں کو نہ کریں، اُس کے تلے بے چوبہ
کہ نپٹ کہنہ ہے یہ اور نہایت کو چک
اللہ اللہ ترے مطبخ کا تجمل، جس کا
طبقِ روئے زمیں سے ہے بڑا اخوانِ جشنک
کافی واں زیرے کے محصول نہ ہو کرماں کا
حاصلِ ہند سے پورا نہ پڑے اس میں نمک
بچہ رخ و کہسار کو مصرف سے ہے دہشت واں کے
آپ کو پاکے مشابہ بہ پیاز و ادرک
اُس کے مصرف کے جو دیہات ہیں بس اُن میں سے
اپنے مداح کو بھی کہہ دے مقرر صحنک

تو ہی اب دل میں کہ آپ عرض مرے کا انصاف
جائیے کس در پہ کہو پہنچ کے ایسے در تک
جبہہ سائی ہے پرکھ یاں نذرِ انساں کے لئے
آستاں کا ہے ترے سنگ بر از سنگِ محک
ختم کر اب تو دعائیہ پہ سودا یہ کلام
آمیں کہنے کو گئے بابِ اجابت پہ ملک
یا الٰہی جو یہ تیرا ہے چراغِ دولت
تا ابد اُس سے منور رہے قندیلِ فلک
تا قیامت رہے مسجودِ خلائق وہ جگہ
مسندِ جاہ کی تیرے بچھے جس پہ تو تنک
جو ترا دوست ہو اب آئینۂ گیتی پر
اُس کی تمثال کبھی ہونے نہ پائے منفک
کاتبِ دستِ قضا شکلِ عدو کی تیرے
صفحۂ ہستی سے جوں حرفِ غلط کر دے حک

(۹)

کچھ سودا کے بارے میں

غزل و قصیده و مثنوی و قطعه و مخمس و رباعی ہمہ را خوب می گوید
سرآمدِ شعرائے ہندی اوست۔ بسیار خوش گو است۔

(نکات الشعراء۔ میر)

درمضمارِ قصیده گوئی گوئے سبقت از عرفی و خاقانی ربوده و در
غزل گوئی سلیم و کلیم را پس پشت می گذارد۔ بسیار خوش گو و
پرگو است۔

(طبقات الشعراء۔ شوق)

اگر در مثال بندیٔ اشعار غزل صائبِ وقتش گویم بجا است و اگر
در علوِ مراتبِ معانی ابیاتِ قصیده خاقانی گویم روا۔

(تذکرہ ہندی۔ مصحفی)

غزل را بہ آں پاکیزگی و ملاحت ادا نمودہ کہ اگر می بود صائب خود داد آں می داد۔ و رتبہ قصیدہ بآں متانت و علو رسانیدہ کہ عرفی اگر می خواند تلمیذ انہ سر ادب بپایش می نہاد۔

(دستور الفصاحت۔ احمد علی یکتا)

ضرب المثل بعضے آں کہ سر آمدِ شعرائے فصاحت آ مامرزا محمد رفیع سودا در غزل گوئی سخن بوئے نرسانیدہ اما حق آں است کہ ع

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

مرزا دریائے بیکراں و میر نہرے است عظیم الشان۔ در معلومات قواعد فن میر را بہ میرزا برتری است و در قوتِ شاعری مرزا را بہ میر بہر وری۔

(مجموعۂ نغز۔ قاسم)

آنکہ بین الانام شہرت پذیر است کہ قصیدہ اش بہ از غزل است حرفیست مہمل۔ بزعمِ فقیر غزلش بہ از قصیدہ است و قصیدہ اش بہ از غزل۔ اگر گوئی کہ غزل از اشعار بُرہ کُن مملو است و قصیدہ از آں خالی زیادہ ازیں چہ تواں گفت

که قباحتِ تحقیق بر نظّار گیانِ دیوانش خالی و دخلة السرّ آن است
که قدما را مانندِ فصحائے متاخرین پیرامونِ خاطر و جاگزینِ دل نه
این بود که هر شعر دلپذیر آید و هر بیت خاطر نشین لهذا در کلام اینان
قصص الجمل واقع شده چه در قصیده و چه در غزل مع انهم اولون و
الموجدون والا خاطر بجمیع فنون ها منعقد للمتقدمین و لهذا زمن قال
العلم للمتاخرین پس بنا برین مقدمات برین بزرگان وارد گیر زنهار
سزاوار نیست وطعن و تعریض لائق نه معهذا اشعارِ منتخب و منتخبِ
ایشان باید نگریست که در چه رتبتِ عالی و مکانتِ فخیم جلوهٔ ظهور
گرفته ...

(گلشنِ بے خار شیفتہ)

کہتے ہیں کہ مرزا قصیدہ کے بادشاہ ہیں مگر غزل میں میر تقی کے برابر
سوز و گداز نہیں۔ یہ بات کچھ اصلیت رکھتی ہے ..... مرزا صاحب
کی طبیعت ہمہ رنگ اور ہمہ گیر۔ ذہن برّاق و زبان مشاق رکھتے تھے۔
توسنِ فکر ان کا منہ زور گھوڑے کی طرح جس طرف جاتا تھا رک نہ سکتا

تھا۔ کوئی بحر اور کوئی قافیہ ان کے ہاتھ آ گئے۔ تغزل کی خصوصیت نہیں رہتی تھی۔ جس برجستہ مضمون میں بندھ جاتے باندھ لیتے تھے۔ بیشک ان کی غزلوں کے بھی اکثر شعر چستی اور درستی میں قصیدہ کا رنگ دکھاتے ہیں۔

(آبِ حیات۔ آزاد)

مشہور ہے کہ سودا قصیدہ میں اور میر غزل میں استاد ہیں۔ اور اُن کی غزل سُست ہوتی ہے اور اِن کا قصیدہ سست ہے۔ یہ بات حدِ تحقیق سے دُور ہے۔ سودا کی غزلیں بھی ہرگز سست نہیں۔ البتہ میر سے غزلیں انہوں نے کم کہی ہیں اور قصائد بہت کہے ہیں۔

(شرحِ دیوانِ غالب نظم)